ایف اے
داخلہ جاری

اقتدار احمد ویلفیئر ٹرسٹ کے زیر اہتمام

ایف اے اور بی اے کی معیاری تعلیم کا جدید ادارہ

طُوبیٰ گرلز کالج لاہور

اسلامی تعلیمات اور نظریہ پاکستان کے فروغ پر خصوصی توجہ

باپردہ اور پاکیزہ ماحول
خوبصورت اور کشادہ عمارت

ماڈرن کمپیوٹر لیب اور کمپیوٹر کی لازمی تعلیم بلا اضافی فیس

طالبات کے لئے ٹرانسپوٹ (Pick & Drop) کی سہولت

بیرون لاہور کی طالبات کے لیے ہوسٹل کی محدود سہولت

مزید معلومات کے لئے پراسپیکٹس حاصل کریں

طُوبیٰ گرلز کالج 78 سیکٹر اے ون ٹاؤن شپ لاہور

فون 5114581 E-mail: toobacollege@ hotmail.com

DESIGN UNIT

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ
خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدّین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی

معاون: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

ادارۂ تحریر: حافظ خالد محمود خضر، پروفیسر حافظ نذیر احمد ہاشمی

جلد ۲۱ | جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ - جولائی ۲۰۰۲ء | شمارہ ۷

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور ۱۴- فون: ۵۸۶۹۵۰۱

کراچی آفس: ۱۱-داؤد منزل متصل شاہ بحری، شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۹۵۸۶

سالانہ زرِ تعاون: 100 روپے
فی شمارہ 10 روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرف اول

قرآن کالج ـــــ ایک منفرد تعلیمی ادارہ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے تحت خدمت قرآنی اور تحریک رجوع الی القرآن کی جو اسکیمیں برسرعمل ہیں ان میں قرآن کالج کو ایک اہم مقام حاصل ہے ـــــ یہ دراصل ہمارے ملک میں رائج دو مختلف نظام ہائے تعلیم کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور طلبہ کو قرآنی افکار سے آشنا کرنے کی ایک کوشش ہے ـــــ سکولوں اور کالجوں میں اصل زور عصری اور دُنیوی تعلیم پر ہوتا ہے جبکہ اسلامیات کا ایک مضمون برائے بیت شامل کیا جاتا ہے جس کے ذریعے اسلام کے بارے میں کچھ ابتدائی معلومات تو طلبہ کو حاصل ہوتی ہیں لیکن دین کا ایک جامع و ہمہ گیر تصور اور قرآن حکیم کی وہ فکری و عملی رہنمائی جس کے ذریعے طلبہ کا ایک ذہنی و فکری رشتہ قرآن حکیم اور دین اسلام کے ساتھ قائم ہو جائے' بالکل مفقود ہے ـــــ دوسری طرف دینی مدارس میں علوم دینیہ کی تدریس تو ہوتی ہے' لیکن عصری علوم کا تا حال وہاں گزر نہیں ہے- واضح رہے کہ دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں بھی مرکز و محور کی حیثیت فقہ اور اصول فقہ کو حاصل ہے۔ فکری و نظری اور علمی و عملی رہنمائی کی حیثیت سے قرآن و حدیث کا مطالعہ وہاں بھی قریباً مفقود کے درجے میں ہے- قرآن و حدیث کے حوالے سے عملی رہنمائی کا صرف وہی پہلو جس کا تعلق فقہ اور فقہی مسائل کے ساتھ ہے' بالعموم وہاں زیر بحث آتا ہے۔

بہر کیف اس تناظر میں قرآن کالج کا قیام اس مقصد کے تحت عمل میں لایا گیا ہے کہ یہاں بورڈ اور یونیورسٹی کی نصابی تعلیم کے ساتھ ساتھ طلبہ کے ذہنوں میں فکر قرآنی کی تخم ریزی کا اہتمام کیا جائے اور قرآن و حدیث کے حوالے سے دین کے حقیقی اور حرکی تصور سے انہیں روشناس کرایا جائے۔ قرآن سے قریب لانے کی خاطر یہاں عربی زبان اور تجوید کی تدریس کا بھی ابتدائی درجے میں اہتمام کیا جاتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مرکزی انجمن کے وابستگان اور قارئین ''حکمت قرآن'' اس کالج کے وجود کو غنیمت جانتے ہوئے اسے اپنے حلقۂ احباب میں متعارف کروائیں' خود اپنے بچوں کو بھی اس قرآنی درسگاہ میں بھیجیں جہاں بورڈ اور یونیورسٹی کی بھی معیاری تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے اور ماحول بھی نہایت باوقار اور سنجیدہ ہے۔ مزید برآں اپنے حلقہ احباب کو بھی اس جانب متوجہ کریں ـــــ انٹرمیڈیٹ سال اول میں داخلہ کا آغاز ہو چکا ہے۔ اس کا تفصیلی اشتہار اسی شمارے کے بیک ٹائٹل پر دیکھا جا سکتا ہے۔ oo

درس ۲۵

فتح و نصرت کا نقطۂ آغاز
صلح حدیبیہ

﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا﴾
سورۃ الفتح کے آخری رکوع کی روشنی میں

نحمدہٗ ونصلّی علٰی رسولہ الکریم ..... امّا بعد:

فاعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرّجیم ۔ بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

﴿لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ؕ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ۞ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۞ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۡ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۞﴾ ..... صدق اللّٰہ العظیم

یہ سورۃ الفتح کے آخری رکوع کی آیات ہیں۔ سورۃ الفتح کے بارے میں یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ وہ تقریباً کل کی کل صلح حدیبیہ کے گرد گھومتی ہے۔ سیرتِ مطہرہ میں یہ ایک اتنا اہم واقعہ تھا کہ اس پر ایک پوری سورۂ مبارکہ نازل ہوئی جس کا آغاز ان الفاظِ مبارکہ سے ہوا: ﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا ۞﴾ ''(اے نبی ﷺ!) ہم

نے آپ کو ایک کھلی فتح عطا فرمائی''۔

عام طور پر سطح بین لوگوں کے لئے فتح مکّہ کا واقعہ زیادہ اہم ہے' لیکن قرآن مجید پر اگر غور کیا جائے' حالات کے اصل رخ کو سمجھا جائے اور حالات کی رفتار کی نبض پر اگر ہاتھ ہو تو واقعتاً یہ بات سامنے آتی ہے کہ فتح عظیم اور فتح مبین دراصل صلح حدیبیہ ہی تھی کہ جس کے بعد حالات اس تیزی سے مسلمانوں کے حق میں تبدیل ہوئے کہ یہ صلح درحقیقت فتح مکّہ کی تمہید ثابت ہوئی' جس کے نتیجے میں سرزمین عرب پر اسلام کا بول بالا ہو گیا۔

غزوۂ احزاب ۵ ھ میں واقع ہوا۔ یہ درحقیقت مشرکین عرب کی جانب سے نبی اکرم ﷺ کا راستہ روکنے کی ایک متحدہ کوشش تھی۔ اس کے لئے اتنی بھرپور تیاری ہوئی تھی' اتنا اہتمام ہوا تھا' اتنے مختلف گروہ اور اتنی مختلف قومیں اس میں جمع ہوئی تھیں کہ اس کا دوبارہ پھر اسی اہتمام کے ساتھ اعادہ تقریباً ناممکن تھا۔ نبی اکرم ﷺ کا دست مبارک حالات کی نبض پر تھا۔ آپؐ نے صورتِ حال کا صحیح صحیح اندازہ کر لیا تھا۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے تائید غیبی اور معجزانہ امداد کے ذریعے اس غزوہ میں فتح عطا فرما دی اور دشمنوں کے لشکروں کو بے نیل و مرام واپس لوٹنا پڑا تو حضور ﷺ نے یہ خبر دے دی کہ ((لَنْ یَّغْزُوْکُمْ قُرَیْشٌ بَعْدَ عَامِکُمْ ھٰذَا)) اے مسلمانو! اب قریش دوبارہ تم پر حملہ آور نہیں ہوں گے۔ گویا آپؐ نے مسلمانوں کو صاف الفاظ میں فرما دیا کہ کفار کی قوّت اب ٹوٹ چکی ہے' ان کی ہمت جواب دے چکی ہے' یہ آخری بار تھی کہ انہوں نے اپنی ہمت کو مجتمع کر کے اتنا بھرپور حملہ کیا تھا۔ ساتھ ہی آپؐ نے یہ نوید بھی سنائی: ((وَلٰکِنَّکُمْ تَغْزُوْنَھُمْ)) کہ اب صورتِ حال تبدیل ہو چکی ہے' (Tables have been turned) اب تم اقدام کرو گے' آئندہ آغاز تمہاری جانب سے ہوگا۔ اس سے صاف اندازہ ہو جاتا ہے کہ حالات کی رفتار پر نبی اکرم ﷺ کی پوری نگاہ تھی' پوری صورتِ حال آپؐ کے سامنے عیاں تھی۔ چنانچہ اگلے ہی سال نبی اکرم ﷺ نے عمرے کے ارادے سے مکّے کا سفر اختیار فرمایا۔

مسلمانوں کا سفرِ عمرہ۔ مشرکین مکّہ کی طرف سے مزاحمت

چشم تصور سے دیکھئے' مسلمان احرام باندھے ہوئے ہیں' ہتھیار اگرچہ ساتھ لئے ہیں لیکن نمایاں نہیں ہیں' تلواریں نیاموں کے اندر ہیں' ہدی کے جانور ساتھ ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ چودہ سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم محو سفر ہیں' مکّے کی طرف منزل بہ منزل سفر طے ہو رہا ہے۔ ادھر مکّے میں خبر پہنچی تو کہرام مچ گیا۔ مسلمانوں کو عمرے کے لئے آنے کی جرأت کیسے ہوئی؟ یہ چودہ سو مسلمان کس ارادے سے آ رہے ہیں؟ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ اہل مکّہ کے لئے ایک عجیب اور پیچیدہ صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ مسلمانوں کو مکّہ میں داخلے کی اگر اجازت دیتے ہیں تو یہ گویا شکست تسلیم کرنے کے مترادف ہے۔ انہیں اگر روکنے کی کوشش کرتے ہیں تو اپنی حالت بھی نگاہوں کے سامنے ہے کہ اب اتنے طاقتور نہیں رہے کہ محمد ﷺ اور ان کے ساتھیوں کو روک سکیں۔ لیکن بہرحال جو بھی قوت تھی اسی پر انحصار کرتے ہوئے اپنی ہمت کو مجتمع کر کے انہوں نے یہ طے کیا کہ جس طرح بھی ہو اس وقت تو ہم محمد (ﷺ) کو مکّے میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔

حضور ﷺ حدیبیہ کے مقام پر پہنچ کر پڑاؤ ڈال دیتے ہیں۔ سلسلۂ جنبانی کا آغاز ہوتا ہے۔ سفارتیں آنی شروع ہوئیں' ادھر مکّہ سے کچھ لوگ آئے' انہوں نے کوشش کی کہ مسلمانوں کو مرعوب کریں' لیکن واقعہ یہ ہے کہ خود مرعوب ہو کر واپس لوٹے۔ سہیل بن عمرو' قریش مکّہ کا ایک بہت بڑا خطیب جا کر لوگوں کو خبر دیتا ہے کہ لوگو میں نے بڑے بڑے شہنشاہوں کے دربار دیکھے ہیں' لیکن جس طرح محمد (ﷺ) پر ایمان لانے والے اُن پر پروانہ وار نچھاور ہونے کو تیار ہیں وہ عزت و احترام اور وہ محبت میں نے کبھی کسی انسان کی انسانوں کے دلوں میں نہیں دیکھی۔ لیکن بہرحال کفارِ مکّہ اس طرح فوری طور پر اپنی آن سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھے۔ مسلمانوں کے کیمپ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو سفیر کی حیثیت سے بھیجا جاتا ہے۔ ان کی واپسی

میں تاخیر ہو جاتی ہے۔ خبر اڑتی ہے کہ شاید وہ شہید کر دیئے گئے ہیں۔ اس پر حضور ﷺ بیعت لیتے ہیں' جسے سیرت کی کتابوں میں بیعتِ رضوان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ چودہ سو صحابہ نبی اکرم ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں اور خونِ عثمانؓ کا قصاص لینے کا عزم کرتے ہیں۔ اس واقعے کا ذکر اسی سورۂ مبارکہ میں موجود ہے:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾

(آیت ۱۸)

''اللہ تعالیٰ راضی ہو گیا ان اہلِ ایمان سے جنہوں نے (اے نبی ﷺ) آپ کے ہاتھ پر بیعت کی درخت کے نیچے۔''

اور

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ﴾ (آیت ۱۰)

''(اے نبی ﷺ) جن لوگوں نے آپ سے بیعت کی ہے انہوں نے درحقیقت اللہ سے بیعت کی ہے' ان کے ہاتھوں کے اوپر اللہ کا ہاتھ ہے''۔

بعد میں معلوم ہوا کہ یہ خبر بے بنیاد تھی۔

صلح کی یکطرفہ شرائط۔ مسلمانوں کی ہیجانی کیفیت

بہرحال اس دوطرفہ گفت وشنید کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک مصالحت ہو جاتی ہے۔ وہ مصالحت کہ جو بظاہر نبی اکرم ﷺ کی طرف سے کسی قدر دب کر ہو رہی ہے' بظاہر کفر کو اِس میں ایک غالب حیثیت حاصل ہے۔ طے ہو رہا ہے کہ آپ اس سال عمرہ نہیں کریں گے' اسی طرح واپس چلے جائیں گے' ہاں اگلے سال عمرہ ادا کرنے کے لئے آ سکتے ہیں۔ آئندہ دس سال کے لئے جنگ بندی کا معاہدہ (No War Pact) ہو رہا ہے۔ اس میں کفار کی طرف سے یہ شرط بھی رکھی جاتی ہے کہ اگر کوئی مسلمان مکّے سے بھاگ کر مدینے پہنچا تو آپ کو واپس کرنا ہوگا اور اگر مدینے سے کوئی مسلمان مرتد ہو کر مکّے میں آ جاتا ہے تو ہم اس کو واپس کرنے کے پابند نہیں ہوں گے۔ آنحضور ﷺ اس شرط کو بھی تسلیم فرما لیتے ہیں۔ یہ ساری شرطیں مُنہ سے بول رہی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ

کی طرف سے کچھ دب کر صلح کی جا رہی ہے۔ صحابہ کرامؓ میں اضطراب و بے چینی ہے۔ وہ بے چینی خاص طور پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شخصیت میں نمایاں ہو جاتی ہے۔ پریشان ہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے' کیوں ہو رہا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ سے کہتے ہیں کہ کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟ اگر حق پر ہیں تو پھر ہم دب کر صلح کیوں کر رہے ہیں؟ یہی سوال وہ کسی قدر نامناسب لہجے میں خود نبی اکرم ﷺ سے بھی کرتے ہیں جس میں شدتِ جذبات کا رنگ غالب تھا' جس پر کہ پھر ساری عمر وہ کف تاسف ملتے رہے اور افسوس کرتے رہے۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ یہ انداز درحقیقت حمیت و غیرتِ ایمانی کا مظہر تھا۔

وہی حمیت و غیرتِ ایمانی ایک اور انداز میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے بھی اُس موقع پر ظاہر ہوئی جب معاہدہ لکھا جا رہا تھا۔ حضور ﷺ املا (dictate) کروا رہے ہیں اور حضرت علیؓ لکھ رہے ہیں: ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' قریش کا نمائندہ اعتراض کرتا ہے کہ نہیں' جو پرانا انداز تھا اسی کو اختیار کیا جائے ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' کی بجائے ''بِاسْمِکَ اللّٰھُمَّ'' کے الفاظ لکھے جائیں جو ہماری پرانی روایت کے مطابق ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا ٹھیک ہے۔ آگے لکھا جاتا ہے: ''یہ ہے وہ معاہدہ جو محمد رسول اللہ اور قریش کے مابین ہوا''۔ اس پر نکتۂ اعتراض بلند کیا جاتا ہے کہ ہم آپ کو اللہ کا رسول نہیں مانتے' اگر رسول مان لیں تو سارا جھگڑا ختم ہو جائے' لہٰذا یوں لکھا جائے کہ ''یہ محمد بن عبداللہ اور قریش کے مابین معاہدہ ہے''۔ حضور ﷺ مسکراتے ہوئے حضرت علیؓ سے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ کے الفاظ مٹا دو۔ حضرت علیؓ عرض کرتے ہیں کہ حضور! میرے اندر اس کی تاب نہیں ہے۔ گویا کہ یہاں بظاہر حکم عدولی ہو رہی ہے لیکن یہ بھی درحقیقت غیرت و حمیت ایمانی کا اظہار تھا۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ مجھے دکھاؤ وہ الفاظ کہاں ہیں اور پھر اپنے دست مبارک سے ''رسول اللہ'' کے الفاظ مٹا دیتے ہیں۔

اس پورے پس منظر میں جو بات دراصل سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ بظاہر دب کر جو صلح کی جا رہی تھی وہ کچھ ہی عرصے کے بعد ایک کتنی بڑی فتح مسلمانوں کے حق میں

ثابت ہوئی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حالات کا رُخ کس درجے محمد رسول اللہ ﷺ پر روشن تھا۔ اس صلح کو بلاشبہ آپؐ کے تدبر کا شاہکار قرار دیا جاسکتا ہے۔

تمام مسلمانوں کی ذہنی و جذباتی کیفیت اُس وقت کم و بیش وہی تھی جس کی کسی قدر عکاسی حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے طرزِ عمل سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ دیکھ کر کہ کفارِ مکّہ کی ہر شرط حضور ﷺ قبول کئے جا رہے ہیں' ان پر شدید اضطرابی کیفیت طاری تھی۔

اس سلسلے کا یہ واقعہ بھی بڑا عجیب ہے کہ جب صلح کی بات مکمل ہوگئی تو حضور ﷺ نے مسلمانوں سے کہا کہ اب احرام کھول دو اور قربانی یہیں دے دو' لیکن کوئی شخص اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ آپؐ نے دوبارہ یہی بات ارشاد فرمائی' لیکن اب بھی کوئی نہیں اٹھ رہا۔ یہاں تک کہ تیسری مرتبہ فرمانے پر بھی کسی کو جنبش نہیں ہوئی۔ اس پر حضور ﷺ کچھ ملول ہو کر اپنے خیمے میں تشریف لے جاتے ہیں اور اپنی زوجہ محترمہ اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کسی قدر شکوے کے انداز میں کہتے ہیں کہ میں نے تین مرتبہ مسلمانوں سے احرام کھولنے کو کہا لیکن کوئی ایک شخص بھی نہیں اٹھا۔ حضرت ام سلمہؓ مسلمانوں کی جذباتی حالت کے پیشِ نظر مشورہ دیتی ہیں کہ حضور! آپ کسی سے کچھ نہ کہئے' بس اتنا کیجئے کہ خود اپنا احرام کھول دیجئے اور قربانی دے دیجئے' آپ سے آپ معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔ اور بعینہٖ یہی ہوا۔ جیسے ہی حضور ﷺ نے اپنا احرام کھولا اور قربانی دی' یوں محسوس ہوا گویا کہ بند کھل گئے اور سب صحابہؓ نے آپؐ کی پیروی کی۔

صلح کے اثرات۔ مسلمانوں کے حق میں

یہ صلح اس اعتبار سے بڑی اہم ہے کہ اس کے بعد نبی اکرم ﷺ کو دو سال کا عرصہ ایسا ملا جس میں آپؐ نے کئی محاذوں پر اپنے کام کو وسعت دی۔ جنگ و جدال کا خاتمہ ہوگیا۔ قریش کے ہاتھ گویا کہ بندھ گئے اور محمد ﷺ کے ہاتھ کھل گئے۔ دعوت و تبلیغ کا عمل پوری شدت کے ساتھ جاری ہوگیا۔ وہ اصحابِ صفہ جن کی تربیت مسجد نبویؐ میں ہو رہی تھی اب ان کے وفود تشکیل دیئے جا رہے ہیں' جزیرہ نمائے عرب کے طول و عرض میں تبلیغی سرگرمی اپنے پورے نقطۂ عروج کو پہنچ گئی ہے۔ یہی وہ دَور ہے کہ جس

میں نبی اکرم ﷺ نے یہود کی قوت پر آخری اور بھرپور وار کیا۔ اُس وقت تک یہود کے تینوں قبیلے مدینہ منورہ سے نکل چکے تھے۔ بنوقینقاع کو غزوۂ بدر کے فوراً بعد ۲ھ میں اور بنونضیر کو ۴ھ میں دیس نکالا دیا گیا تھا' جبکہ بنوقریظہ کو ان کی عہد شکنی کی پاداش میں سخت ترین سزا دی گئی تھی۔ ان کے جنگ کے قابل تمام مرد قتل کیے گئے تھے اور ان کا مال واسباب مسلمانوں نے اپنی ملکیت میں لے لیا تھا۔ بہرحال یہود کی ساری بچی کھچی قوت اب خیبر میں مجتمع ہو چکی تھی اور یہ اب یہود کے جلاوطن قبائل کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے ۷ھ میں اس پر حملہ کیا اور اللہ نے مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی۔

دعوت کے بین الاقوامی مرحلے کا آغاز

اسی دو سال کے عرصے میں نبی اکرم ﷺ نے پہلی بار اپنی دعوت کو آس پاس کے علاقوں میں وسعت دینے کے لئے قدم اٹھایا۔ یہ معاملہ سیرت میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل سورۃ الجمعۃ کے درس کے ضمن میں عرض کیا جا چکا ہے کہ حضور ﷺ کی بعثت صرف عرب کے لئے نہ تھی بلکہ آپؐ پوری نوعِ انسانی کی جانب رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ لیکن دیکھئے کہ دعوت میں جو تدریج نبی اکرم ﷺ نے ملحوظ رکھی وہ کس قدر منطقی اور معقول ہے۔ تیرہ برس تک نبی اکرم ﷺ نے اپنی دعوت وتبلیغ کو صرف مکّے تک محدود رکھا۔ صرف ایک سفر کا ذکر ملتا ہے' یعنی طائف کا سفر۔ اور انہی دنوں میں ایک اور سفر بھی آپؐ نے کیا اور وہاں سے بھی آپ کو بظاہر ناکام ہی لوٹنا پڑا۔ تیرہ برس کے عرصے میں اہل مکّہ نے جب اپنے طرزِ عمل سے ثابت کر دیا کہ اس دعوت کے لئے اب یہاں مزید کوئی امکانات نہیں ہیں تب آپؐ مدینے تشریف لائے۔ ہجرتِ مدینہ کے بعد بھی مسلسل سات برس تک آپؐ نے اپنی تمام مساعی کو اندرونِ ملک عرب مرکوز رکھا۔ حالانکہ آپؐ عرب اور عجم دونوں کی طرف مبعوث ہوئے تھے' آپؐ کی بعثت پوری نوعِ انسانی کے لئے تھی۔ چنانچہ نظری طور پر اس کا امکان تھا کہ جب آپؐ نے مکّے میں اپنی دعوت کا آغاز کیا اسی وقت آپؐ قیصر

روم کو' کسریٰ فارس کو' مقوقس شاہ مصر کو اور نجاشی شاہ حبشہ کو بھی خطوط لکھ دیتے اور ان کی طرف ایلچی روانہ کر دیتے۔ لیکن نہیں' یہ بات ایک تدریج ہی کے ساتھ ہو سکتی تھی اور اس تدریج ہی میں معنویت پنہاں تھی۔ چنانچہ ۷ھ میں جب کہ اندرونِ ملک عرب نبی اکرم ﷺ کی قوت کو تسلیم کیا جا چکا تب آپ نے بیرونِ ملک عرب اپنے خطوط اور ایلچی بھیج کر اپنی دعوت کے بین الاقوامی مرحلے کا آغاز فرمایا۔ صلح حدیبیہ درحقیقت اس بات کی علامت (symbol) تھی کہ قریش نے نبی اکرم ﷺ اور مسلمانوں کی اس حیثیت کو تسلیم کر لیا کہ اب آپؐ بھی ملک عرب کی ایک اہم طاقت ہیں۔ جب اس حد تک جزیرہ نمائے عرب کے اندر ایک فیصلہ کن حیثیت حاصل ہو گئی تب آپؐ نے اپنی دعوت و تبلیغ کا دائرہ وسیع کیا۔ یہی زمانہ ہے جب کہ آپؐ نے دعوتی خطوط بھیجے۔ یہی وہ وقت ہے جب آپؐ کے ایلچی آپ کے نامہ ہائے مبارک لے کر ہرقل روم کے دربار میں بھی گئے اور شاہِ ایران اور مقوقس مصر کے دربار میں بھی پہنچے۔ اسی طرح اطراف و جوانب کے جتنے بھی حکمران تھے ان کی طرف آپ نے دعوتی خطوط بھیجے۔ یوں سمجھئے کہ صلح حدیبیہ کے بعد نبی اکرم ﷺ کی جدوجہد کے دو رخ ہو گئے۔ ایک جانب ابھی اندرونِ ملک یعنی جزیرہ نمائے عرب کے اندر اس انقلاب کی تکمیل کے لئے جدوجہد جاری ہے تو دوسری جانب بیرونِ عرب بین الاقوامی سطح پر پیغامِ محمدی' دعوت و تبلیغ اسلام کا آغاز ہو رہا ہے۔

اس سے قبل کہ ہم نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے ان آخری سالوں کے دوران آپؐ کی جدوجہد کے ان دونوں رخوں کو سمجھنے کی کوشش کریں' آیئے کہ پہلے ایک نگاہ ان آیاتِ مبارکہ کے ترجمے پر ڈال لیں جن سے اس گفتگو کا آغاز ہوا تھا' یعنی سورۃ الفتح کے آخری رکوع کی آیات۔

آیاتِ مبارکہ کے ترجمے پر ایک نظر

﴿لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ﴾ ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کا

خواب سچا کر دکھایا۔'' حضورؐ نے عمرے کی غرض سے جس سفر کا ارادہ فرمایا تھا اس سے پہلے آپؐ نے ایک خواب دیکھا تھا کہ آپؐ عمرہ ادا فرما رہے ہیں۔ نبی کا خواب ایک نوع کی وحی ہوتا ہے' چنانچہ آپؐ نے اسی کی بنیاد پر سفر اختیار فرمایا۔ جب صلح حدیبیہ کے بعد یہ طے ہو گیا کہ عمرہ اس سال نہ ہو سکے گا تو بعض حضرات نے یہ خیال کیا کہ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ وہ خواب جھوٹا ہو گیا! نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ !! حضور ﷺ نے یہ وضاحت فرما کر ان کے اس مغالطے کو دُور کیا کہ میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ یہ خواب اسی سال ضرور پورا ہو گا' ہم عمرہ ان شاء اللہ ضرور کریں گے' یہ خواب غلط نہیں ہے۔ کم از کم اس سفر کا یہ فائدہ تو ہوا کہ مشرکین مکّہ نے مسلمانوں کی حیثیت کو تسلیم کر لیا اور آئندہ سال کے لئے طے ہو گیا کہ مسلمان عمرہ ادا کریں گے اور مشرکین ان کی راہ میں حائل نہیں ہوں گے۔ چنانچہ اگلے سال کے ذوالقعدہ ۷ھ میں وہ عمرہ ہوا جسے عمرۂ قضاء کہتے ہیں۔ تو یہاں دراصل اسی بات کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کا خواب سچا کر دکھایا۔

﴿لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ؕ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝﴾

''تم یقیناً داخل ہو گے مسجدِ حرام میں' ان شاء اللہ پورے امن کی حالت میں' اپنے سروں کو مونڈتے ہوئے بھی اور بال ترشوائے ہوئے بھی' اس حالت میں کہ تمہیں کسی کا خوف نہ ہو گا۔ تو اللہ جانتا ہے جو کچھ کہ تم نہیں جانتے' پس اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے ایک قریبی فتح کا سامان کر دیا۔''

یعنی یہ کہ یہ صلح اب تمہارے لئے کامیابیوں کے نئے نئے دروازے کھولنے کا باعث بنے گی۔ تم بہت جلد اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے کہ صلح کے جس معاہدے کو قریش مکّہ اپنی فتح سمجھ رہے تھے وہ ان کی شکست تھی۔ چنانچہ وہ عمومی تاثر کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے دب کر صلح کی ہے' غلط ثابت ہوا اور یہ صلح مسلمانوں کے حق میں ایک فتح عظیم ثابت ہوئی۔

اس کے بعد یہاں سورۃ الفتح کے آخری رکوع میں بھی وہی آیۂ مبارکہ وارد ہوئی

ہے جو آنحضور ﷺ کے مقصدِ بعثت کے بیان کے ضمن میں قرآن حکیم کی اہم ترین آیت ہے۔ (واضح رہے کہ یہ آیت اس سے قبل سورۃ الصف کے درس کے ضمن میں ہمارے مطالعے سے گزر چکی ہے) اس آیت کو اگر پورے قرآن مجید کا عمود قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ ''وہی ہے (اللہ) جس نے اپنے رسول (محمد ﷺ) کو مبعوث فرمایا الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دین حق دے کر تاکہ غالب کر دے اسے پورے کے پورے دین (یعنی نظامِ زندگی) پر''..... ﴿وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ۝﴾ ''اور کافی ہے اللہ گواہی دینے والا۔'' اللہ کا یہ فیصلہ ہے کہ یہ ہو کر رہے گا' اور یہ دعوت درحقیقت اپنی اس منزل سے قریب ہوا چاہتی ہے' کامیابی اس کے قدم چوما چاہتی ہے۔

اگلی آیت میں فرمایا: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ﴾ ''محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں۔'' ﴿وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ﴾ ''اور وہ لوگ کہ جو اُن کے ساتھ ہیں۔'' یعنی آپؐ پر ایمان لانے والے آپؐ کے صحابہؓ' آپؐ کے جاں نثار' آپؐ کے دست و بازو' آپؐ کے اعوان و انصار رضی اللہ عنہم اجمعین۔ یہ مقامِ عظمتِ صحابہ کے بیان کے ضمن میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ فرمایا: ﴿وَالَّذِیْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ﴾ ''اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار کے مقابلے میں بڑے سخت اور آپس میں انتہائی نرم ہیں۔'' انہیں اس کی پرواہ نہیں ہوتی کہ مقابلے میں ان کا باپ ہے یا بیٹا۔ ان کا رشتہ صرف اللہ اور اس کے رسولؐ سے ہے۔ ان کی تمام محبتیں اس معیار پر اور اسی ایک بنیاد پر از سرِ نو استوار ہو چکی ہیں۔ جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَاَعْطٰى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِیْمَانَ)) ''جس نے محبت کی تو اللہ کے لئے کی' کسی سے بغض اور عداوت رکھی تو اللہ کے لئے رکھی' کسی کو کچھ دیا تو اللہ کے لئے دیا اور کسی سے کچھ روکا تو صرف اللہ کے لئے روکا' تو وہ ہے کہ جس نے اپنے ایمان کی تکمیل کر لی۔'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس معیار پر کاملتاً پورا اترتے ہیں۔ چنانچہ غزوۂ بدر میں چشمِ فلک نے وہ نظارہ دیکھا کہ باپ اِدھر ہے اور بیٹا اُدھر'

ماموں اِدھر ہے تو بھانجا اُدھر، بھتیجا اِدھر ہے تو چچا اُدھر۔ اِدھر حضور ﷺ ہیں اور اُدھر عباس بن عبدالمطلب ہیں جو اُس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے۔ اِدھر حضرت ابوبکر صدیق ؓ ہیں اور اُدھر ان کے بیٹے عبدالرحمٰن۔ اور ایمان لانے کے بعد عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ نے جب اپنے والدِ محترم حضرت ابوبکر صدیق ؓ سے یہ کہا کہ ابا جان! میدانِ بدر میں آپ میری تلوار کی زد میں آ گئے تھے لیکن میں نے آپ کا لحاظ کیا تو جواب میں حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: بیٹے، یہ اس لئے تھا کہ تمہاری جنگ حق کے لئے نہیں تھی، خدا کی قسم! اگر کہیں تم میری زد میں آ جاتے تو میں بالکل نہ چھوڑتا۔ اس لئے کہ یہاں معاملہ بالکل بدل چکا ہے۔ تاہم دوسری طرف وہ آپس میں انتہائی نرم اور مہربان ہیں۔ ایک دوسرے کے دکھ درد کو بانٹنے والے، ایک دوسرے کے دکھ اور درد کو اپنے باطن میں محسوس کرنے والے، اس شان کے حامل جس کی تعبیر علامہ اقبال نے ایک شعر میں اس طرح کی ہے کہ ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مؤمن!

اور جس کا نقشہ سورۃ المائدۃ میں ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے: ﴿یُحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗۤ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ ۫﴾ ''ان سے اللہ محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں، اہلِ ایمان کے حق میں بہت ہی نرم ہیں لیکن کافروں کے لئے بہت سخت ہیں۔'' کفار کے مقابلے میں ان کے موقف میں کہیں کسی کمزوری کا اظہار نہیں ہوتا۔ ﴿یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ﴾ ''اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں (جان اور مال لگاتے کھپاتے ہیں) اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا کوئی اثر قبول نہیں کرتے۔''

اب ہم سورۃ الفتح کی آخری آیت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ فرمایا: ﴿تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا﴾ ''تم انہیں دیکھتے ہو رکوع کرتے اور سجدہ کرتے ہوئے، وہ اپنے ربّ کے فضل اور اس کی رضا کے متلاشی ہیں''۔ ذہن میں

رکھئے کہ بندۂ مؤمن کی شخصیت کے یہ دو رُخ ہیں جن کا ذکر قرآن میں متعدد مقامات پر ملتا ہے۔ ایک رُخ محبتِ خداوندی' جذبۂ عبودیت اور اس کی کیفیات سے متعلق ہے جبکہ دوسرا جہاد و قتال اور ایثار و قربانی سے عبارت ہے۔ یہاں ان الفاظ میں پہلے رُخ کا بیان ہے کہ: ﴿تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا﴾ ان کی زندگی کا یہ نقشہ تمہارے سامنے ہے کہ وہ اللہ کی جناب میں رکوع اور سجود کرنے والے ہیں' وہ اپنے ربّ کے فضل کے طالب اور اس کی رضا کے جویا ہیں۔ ان کا نصب العین بس رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ ﴿سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ﴾ ''ان کی نشانی ہے ان کے چہروں میں (ان کی پیشانیوں میں) سجدوں کے اثرات سے''۔ ﴿ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ﴾ ''یہ ان کی مثال ہے تورات میں اور ان کی یہ تمثیل ہے انجیل میں بھی''۔ تورات اور انجیل کے بارے میں یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے بارے میں پیشین گوئیاں ان کتابوں میں موجود تھیں جن میں سے بہت سی کھرچ دی گئیں' نام و نشان مٹانے کی ہر ممکن سعی کی گئی پھر بھی کہیں کہیں کوئی کوئی پیشین گوئی باقی رہ گئی۔ قرآن مجید کے یہ الفاظ ثابت کرتے ہیں کہ صرف حضور ﷺ کی نہیں بلکہ صحابہ کرامؓ کی علامات کا بیان بھی تورات اور انجیل میں تھا' ان کی شخصیتوں کے نمایاں اوصاف اور خدوخال بھی ان میں درج تھے۔ وہ مشہور واقعہ اس بات کی تائید کرتا ہے جو بیت المقدس کی فتح کے ضمن میں تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہے کہ جب مسلمان افواج یروشلم کا محاصرہ کئے ہوئے تھیں اور محاصرہ بھی بہت طول پکڑ گیا تو وہاں محصور عیسائی رہنماؤں نے کہا کہ ایک درویش بادشاہ کی علامات ہماری کتابوں میں لکھی ہوئی ہیں جس کے ہاتھوں یہ شہر فتح ہوگا۔ بعد میں ثابت ہوا کہ وہ درویش بادشاہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے۔ اس لئے کہ وہ جب بیت المقدس تشریف لائے تو وہاں کے لوگوں نے اپنی کتابوں سے حضرت عمرؓ کا حلیہ ملانے کے بعد شہر کے دروازے مسلمانوں کے لئے یہ کہتے ہوئے کھول دیئے کہ یہی وہ شخص ہے جس کی علامات ہماری کتابوں میں درج ہیں!

آگے فرمایا: ﴿كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْاَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ﴾ ''اس کھیتی کے مانند جو پہلے اپنی سوئی نکالتی ہے' پھر اس کی کمر کو مضبوط کرتی ہے' پھر ذرا موٹی ہوتی ہے' پھر کھڑی ہو جاتی ہے اپنی نال پر'' ﴿يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ﴾ ''کاشت کار کو وہ بڑی بھلی لگتی ہے (اُس کا دل اس کھیتی کو دیکھ کر باغ باغ ہو جاتا ہے) تاکہ دلوں میں جلن پیدا ہو جائے کفار کے''۔ یہاں کھیتی سے مراد صحابہ کرامؓ کی جماعت ہے۔ یہ پودا جو شروع میں بڑا نرم و نازک اور کمزور تھا اب ایک تناور درخت کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کا کاشت کار کون ہے؟ خود اللہ تبارک وتعالیٰ جس کی یہ کھیتی ہے' یا پھر وہ ذاتِ گرامی ﷺ جس نے اپنے خونِ جگر سے اس کھیتی کو سینچا ہے! آپؐ کا دل اس شاندار فصل کو دیکھ کر باغ باغ ہو جاتا ہے۔ اور وہ کفار و منافقین جن کو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بغض تھا' ان کی کامیابیوں پر اپنے دل میں جلن اور گھٹن محسوس کرتے ہیں۔ ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا﴾ ''ان لوگوں میں سے جو ایمان اور عملِ صالح کے معیار پر پورا اتریں' اللہ نے مغفرت اور اجرِ عظیم کا وعدہ فرمایا ہے''۔ دنیا میں بھی فتح و کامرانی ان کے قدم چوم رہی ہے اور آخرت کے اعتبار سے وہ کامیاب و کامران ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان صاحب ایمان اور نیکوکار لوگوں سے مغفرت اور اجرِ عظیم کا وعدہ کر رکھا ہے۔

صلح کے ٹوٹنے پر قریش کی جانب سے تجدید کی سرتوڑ کوشش

صلح حدیبیہ کے بعد کہ جسے قرآن مجید نے فتح مبین قرار دیا' واقعتاً کامیابیوں نے مسلمانوں کے قدم چومنے شروع کیے اور اس فتح و نصرت کا اظہار دو پہلوؤں سے ہوا۔ ایک یہ کہ جیسا کہ اس سے قبل ایک موقع پر اشارہ کیا جا چکا ہے' اندرونِ عرب دو سال تک یہ صلح قائم رہی اور نبی اکرم ﷺ کو دعوت و تبلیغ کا بھرپور موقع میسر آیا۔ اس دوران بہت سے قبائل نے اسلام قبول کیا اور اسلام کا دائرۂ اثر عرب کے کونے کونے

تک پہنچ گیا۔ اور دوسرے یہ کہ اسی عرصے میں آپؐ نے بیرونِ ملک عرب اپنی دعوتی سرگرمیوں کا آغاز فرمایا' آس پاس کے حکمرانوں کی طرف اپنے سفیر بھیجے اور نامہ ہائے مبارک کے ذریعے انہیں اسلام لانے کی دعوت دی۔

قریش کی ایک غلطی سے یہ صلح ختم ہوئی۔ انہوں نے ایک قبیلے کے خلاف کہ جو مسلمانوں کا حلیف تھا' اپنے ایک حلیف کی مدد کی۔ اس طرح گویا خود انہوں نے معاہدے کی خلاف ورزی کا ارتکاب کیا اور یوں صلح ٹوٹ گئی۔ لیکن اس کے فوراً بعد سردارانِ قریش کو یہ احساس ہو گیا کہ ان سے بہت بڑی حماقت سرزد ہوئی ہے۔ چنانچہ فوراً ہی ان کی جانب سے تجدیدِ مصالحت کی کوششوں کا آغاز ہو گیا کہ کسی طرح صلح دوبارہ ہو جائے۔ ابوسفیان جو اُس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے اور قریش کی سرداری کا منصب انہیں حاصل تھا' صلح کی تجدید کے لئے خود چل کر مدینے آئے۔ اس ضمن میں نہایت دلچسپ اور عجیب واقعات سیرت کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ ابوسفیان مدینے آتے ہیں اور اپنی صاحبزادی حضرت اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا جو آنحضور ﷺ کی زوجۂ محترمہ ہیں' کے پاس جاتے ہیں کہ وہ ان کے لئے اپنے شوہر (یعنی نبی اکرم ﷺ) سے سفارش کریں۔ وہاں یہ عجیب معاملہ پیش آتا ہے کہ گھر میں داخل ہو کر جب چارپائی پر بیٹھنے لگتے ہیں تو اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ذرا رکئے! باپ کو روک کر پہلے وہ بستر تہہ کرتی ہیں اور پھر فرماتی ہیں کہ اب بیٹھئے! قریش کا وہ مدبر سردار جس نے ایک دنیا دیکھ رکھی تھی اور جسے بڑے بڑے درباروں میں حاضر ہونے اور وہاں کے رکھ رکھاؤ اور آداب کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملا تھا' فوراً پوچھتا ہے: ''بیٹی! یہ بستر میرے لائق نہ تھا یا میں اس بستر کے لائق نہ تھا؟'' اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ حبیبہؓ فرماتی ہیں کہ ابّا جان! آپ مشرک ہیں' ناپاک اور نجس ہیں اور یہ بستر محمد رسول اللہ ﷺ کا ہے' لہٰذا آپ اس پر نہیں بیٹھ سکتے.....!

نبی اکرم ﷺ کی فراست اور معاملہ فہمی کی ایک نہایت اعلیٰ مثال یہاں بھی سامنے آتی ہے کہ آپؐ نے تجدید صلح کے لئے جانے والی ان کوششوں کا کوئی مثبت

جواب نہیں دیا اور مشرکین کے ساتھ صلح کی تجدید پر آمادگی ظاہر نہیں کی۔ اس لئے کہ نہ جنگ آپؐ کا اصل مقصود تھی نہ صلح۔ آپؐ کی سعی وجُہد کا اصل ہدف اور مقصود تھا دین کا غلبہ ..... ! جب اس ہدف کے حصول اور دین کی مصلحت کے لئے صلح بہتر تھی تو آنحضور ﷺ نے بظاہر احوال دب کر بھی صلح کر لی۔ (صلح حدیبیہ کی شرائط بالکل یک طرفہ محسوس ہوتی ہیں کہ ان سے بظاہر سارا فائدہ مشرکین کو پہنچ رہا تھا۔) لیکن اب چونکہ صلح کو مزید جاری رکھنے اور صلح کی تجدید کرنے کے معنی یہ ہوتے کہ کفر کو بلا جواز ایک مہلت (Lease of Existence) دے دی جاتی' لہٰذا آنحضور ﷺ نے صلح کی تجدید نہیں فرمائی۔ آپؐ صحیح طور پر اندازہ فرما چکے تھے اور جان چکے تھے کہ اب اِن کفارِ قریش اور مشرکین مکّہ میں کوئی قوتِ مدافعت موجود نہیں ہے۔ غلبہ و اقامت دین کی منزل اب بہت قریب ہے' آپؐ کی انقلابی جدوجہد اَب کامیابی سے ہمکنار ہوا چاہتی ہے' لہٰذا آپؐ نے صلح کی تجدید سے انکار کیا۔

تکمیلِ انقلاب کا عنوان..... فتح مکّہ

اس کے کچھ ہی عرصے بعد رمضان المبارک ۸ھ میں آپؐ دس ہزار صحابہؓ کی معیت میں مکّے کی جانب پیش قدمی فرماتے ہیں۔ اب کسی میں دم نہیں تھا کہ مسلمانوں کی قوت کے سامنے ٹھہر سکتا۔ بعض زیادہ سر پھرے اور جذباتی لوگوں کی طرف سے کچھ تھوڑی سی مزاحمت ہوئی' صرف چند جانیں تلف ہوئیں اور محمد رسول اللہ ﷺ فاتح کی حیثیت سے مکّے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اس موقع پر انبیاء کرامؑ کی سیرت و کردار کا وہ مشترک پہلو سامنے آتا ہے کہ جس کی اس مقدس جماعت سے باہر کوئی دوسری مثال پیش کرنا ناممکن ہے۔ وہ خون کے پیاسے کہ جن کے ظلم وستم کے باعث آٹھ ہی سال پہلے نبی اکرم ﷺ اور ان کے جاں نثار ساتھی اپنی آبائی سرزمین مکّہ چھوڑنے پر مجبور ہوئے تھے اور بمشکل اپنی جان سلامت لے جا سکے تھے' وہی لوگ مغلوبیت کی حالت میں آپؐ کے سامنے تھے اور پورے طور پر آپؐ کے رحم وکرم پر تھے۔ لیکن بجائے اس

کے کہ انہیں کوئی لعنت ملامت اور سرزنش کی جاتی' لسانِ نبوت سے یہ الفاظ جاری ہوتے ہیں کہ میں آج تم سے وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسفؑ نے اپنے ان بھائیوں سے کہی تھی جنہوں نے حضرت یوسفؑ کے ساتھ دشمنی والا معاملہ کیا تھا' یعنی ﴿لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ﴾ "آج کے دن تم پر کوئی ملامت نہیں"۔ "اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ" جاؤ! تم سب کے سب آزاد ہو۔

اندرونِ ملک عرب انقلاب کی تکمیل

اور بیرونِ ملک دعوتی و انقلابی جدوجہد کا آغاز

فتح مکّہ کے بارے میں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اندرونِ ملک عرب یہ گویا کہ نبی اکرم ﷺ کے فیصلہ کن غلبے اور اقتدار کی علامت ہے۔ اس لئے کہ عرب میں خواہ کوئی باقاعدہ مرکزی نظام موجود نہ تھا' کوئی باضابطہ مرکزی حکومت نہ تھی' بہرحال اس خطے میں "اُمّ القریٰ" ہونے کا مقام مکّے ہی کو حاصل تھا۔ یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ مکّہ معظمہ کو مذہبی اور سماجی اعتبار سے ہی نہیں' معاشی اور سیاسی اعتبار سے بھی ملک عرب کے صدر مقام ہونے کی حیثیت حاصل تھی' جس پر اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ کو غلبہ اور تمکن عطا فرما دیا اور یوں اندرونِ ملک عرب آپؐ کی انقلابی جدوجہد تکمیل سے ہمکنار ہوئی۔

غزوۂ حنین..... مشرکین عرب کی جانب سے آخری کوشش

اس کے بعد صرف ایک مزاحمت ہوئی' اور وہ ہوازن اور ثقیف کے لوگوں کی طرف سے تھی۔ یہ قبیلے بڑے زوردار تھے۔ فتح مکّہ کے بعد یہ اہل کفر اور شرک کی طرف سے گویا آخری کوشش تھی۔ جب آنحضور ﷺ کو یہ اطلاع ملی کہ اِدھر جنگ کے لئے تیاریاں ہو رہی ہیں' جمعیت فراہم کی جا رہی ہے' تو آپؐ نے جوابی اقدام کے طور پر اگلے ہی مہینے شوال ۸ھ میں ان کی سرکوبی کے لئے لشکر کشی کی۔ اس مہم کو غزوۂ حنین کے

نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بارہ ہزار کا لشکر آپؐ کے ہمراہ تھا۔ ان میں دس ہزار وہ تھے کہ جو مدینہ سے حضور ﷺ کے ساتھ فتح مکّہ کے وقت آئے تھے اور مزید دو ہزار مکّہ سے شریک ہوئے جن میں کچھ وہ بھی تھے جو فتح مکّہ کے بعد ایمان لے آئے تھے اور کچھ وہ بھی تھے جو ایمان تو نہیں لائے تھے لیکن اب ان کی حیثیت حلیفوں کی تھی۔ بارہ ہزار کا لشکر لے کر آنحضور ﷺ مکّہ مکرمہ سے روانہ ہوئے اور وادیٔ حنین میں وہ واقعہ پیش آیا جس کا ذکر سورۂ توبہ میں سرزنش کے انداز میں آیا ہے:

﴿وَيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ﴾

''اور یاد کرو حنین کے دن کو جبکہ تمہیں اپنی کثرت پر کچھ ناز ہو گیا تھا تو وہ کثرت تمہارے کسی کام نہ آ سکی اور زمین اپنی تمام تر وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی''۔

اندازہ یہ ہوتا ہے کہ بعض حضرات کے ذہن میں یہ خیال آ گیا ہو گا کہ ایک وقت تھا کہ ہم تین سو تیرہ تھے تب ہم نے مار نہ کھائی' تو آج تو بارہ ہزار ہیں' آج ہمیں کون شکست دے گا..... !! اللہ تعالیٰ نے فوراً گرفت فرمائی اور مسلمانوں کو سبق سکھا دیا۔ ہوازن کے لوگ بڑے ماہر تیر انداز تھے۔ وہ گھاٹیوں میں چھپے ہوئے تھے۔ مسلمان جیسے ہی آگے بڑھے اُدھر سے تیروں کی زبردست بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ ایسی بھگدڑ مچی کہ تقریباً پورا لشکر تتر بتر ہو گیا۔ بعض روایات کے مطابق گنتی کے چند صحابہ آنحضور ﷺ کے ساتھ رہ گئے تھے۔ لیکن بعض روایات اور غالباً صحیح تر روایات کی رو سے چند سو صحابہ آپؐ کے ساتھ رہے۔ بارہ ہزار میں سے محض چند سو افراد کا باقی رہ جانا بھی بہرحال ایک بہت بڑی بھگدڑ سے کم نہیں! اُس وقت نبی اکرم ﷺ کی ذاتی شجاعت کا ایک عجیب مظاہرہ سامنے آیا۔ آپ سواری سے اترے' علَم اپنے ہاتھ میں لیا اور یہ رجز پڑھتے ہوئے آگے بڑھے: ((اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِبَ اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ)) ''جان لو کہ میں نبی ہوں اور اس میں کوئی جھوٹ نہیں' اور جان لو کہ میں عبد المطلب کی اولاد میں سے ہوں''۔ یعنی میرے ساتھ بارہ ہزار کا لشکر ہو تب بھی نبی ہوں اور خواہ کوئی میرا ساتھ

دینے والا نہ ہو تب بھی نبی ہوں۔ میری نبوت کا دارومدار میرے ماننے والوں کی قلت وکثرت پر نہیں ہے اور یہ کہ میں عبدالمطلب کا بیٹا میدان میں موجود ہوں۔ پھر آپؐ نے صحابہ کو پکارا: ''یَا اَصْحَابَ الشَّجَرَةِ'' اے وہ لوگو جنہوں نے میرے ہاتھ پر ایک درخت کے نیچے بیعت کی تھی' آؤ میرے جھنڈے تلے جمع ہو جاؤ! اسی طرح مختلف لوگوں کو نام لے کر پکارا۔ حضور ﷺ کی پکار پر لوگ جمع ہوئے اور آخر کار اللہ تعالیٰ نے فتح عطا فرما دی۔ یہ غزوۂ حنین گویا علامت بن گیا اس بات کی کہ اندرونِ ملک عرب اب کوئی ایسی طاقت موجود نہیں رہی جو خم ٹھونک کر مسلمانوں کے مقابلے میں آ سکے۔ چنانچہ اس طرح جزیرہ نمائے عرب پر دین حق کا غلبہ مکمل ہو گیا۔

آنحضورؐ کے حسنِ تدبیر کا ایک اہم واقعہ

غزوۂ حنین کا ذکر نامکمل رہے گا اگر ایک اہم واقعے کا ذکر نہ کیا جائے جس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ سارے معاملات کس طرح بالکل انسانی سطح پر ہوئے۔ وہ ساری پیچیدگیاں اور وہ تمام مشکلات جو دنیا کی کسی بھی اجتماعی جدوجہد اور انقلابی عمل میں پیش آ سکتی ہیں' نبی اکرم ﷺ کو بھی ان کا سامنا کرنا پڑا۔ غزوۂ حنین میں جو مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا اس کی تقسیم میں نبی اکرم ﷺ نے تالیف قلب کو مدنظر رکھتے ہوئے مکّہ کے لوگوں کو کہ جو ابھی نئے نئے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے' دوسروں کی نسبت زیادہ حصّہ دیا۔ منافقین کو آنحضور ﷺ کے خلاف ہرزہ سرائی کا موقع مل گیا۔ باتیں کہی گئیں اور دھڑلے سے کہی گئیں۔ صورت حال کچھ ایسی تھی کہ فی الواقع جنگل کی آگ کی طرح وہ باتیں پھیل گئیں۔ اعتراض کرنے والوں کی زبانیں بے لگام ہو گئیں اور کھلے عام یہ کہا جانے لگا کہ ''جب جان دینے اور خون نچھاور کرنے کا وقت آتا ہے تو ہم لوگ یاد آتے ہیں اور جب مال کی تقسیم کا معاملہ ہوا تو اب اپنے بھائی بند اور اپنے ہم قبیلہ یاد آ گئے' مال کی تقسیم میں انہیں ترجیح دی گئی ہے''۔ وغیرہ وغیرہ۔ اب یہ بات ایسی تھی کہ بظاہر کچھ ایسی خلافِ واقعہ بھی نہیں تھی۔ اس واقعہ کو صحیح پس منظر میں بھی دیکھا جا سکتا تھا اور غلط رخ بھی دیا جا سکتا تھا۔ بات پھیلتے پھیلتے

حضور ﷺ کے کانوں تک بھی پہنچی۔ نبی اکرم ﷺ کا تدبر دیکھئے۔ آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو مجتمع کیا۔ تمام انصار ایک بڑے خیمے میں جمع ہوئے۔ آپؐ نے خطبہ ارشاد فرمایا۔ پہلے اپنے احسانات کا' یا یوں کہئے کہ اللہ کے احسانات کا' جو آپؐ کے طفیل انصار پر ہوئے' تذکرہ فرمایا۔ اے معشر انصار! کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ تم گمراہی پر تھے' اللہ نے میرے ذریعے تمہیں ہدایت دی؟ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ تم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے' اللہ نے میرے ذریعے تمہارے اندر محبت اور اتفاق پیدا کیا؟ انصار جواباً کہتے رہے: بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ !! حضور ﷺ! بالکل ایسا ہی ہے۔ اے اللہ کے رسولؐ! آپ بالکل صحیح کہتے ہیں۔ اس کے بعد آپؐ نے خطاب کا رخ بدلا۔ ہاں اے معشرِ انصار! تم یہ کہو کہ اے محمدؐ تمہیں تمہاری قوم نے اپنے گھر سے نکال دیا تھا' ہم نے تمہیں پناہ دی۔ تمہاری قوم تمہارے خون کی پیاسی تھی' ہم نے تمہاری حفاظت کی۔ اور میرا جواب ہوگا کہ ہاں' تم یہ صحیح کہہ رہے ہو' درست کہہ رہے ہو۔ تو اے معشرِ انصار! کیا تمہیں یہ پسند نہیں ہے کہ لوگ بھیڑیں' بکریاں' اونٹ اور دُنیوی مال واسباب لے کر اپنے گھروں کو جائیں اور تم محمد رسول اللہ (ﷺ) کو لے کر اپنے گھروں کو لوٹو.....!!! انصار کی چیخیں نکل گئیں۔ بے اختیار ان کی زبانوں سے نکلا: رَضِیْنَا' رَضِیْنَا!.....ہم راضی ہیں اس پر' ہم راضی ہیں۔ اس طرح آپؐ کے حسن تدبیر کی بدولت ایک نہایت تشویش ناک صورتِ حال بالکل تبدیل ہوگئی اور مسلمانوں میں جوش وخروش اور جذباتِ ایمانی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ بہر حال غزوۂ حنین کے بعد جیسا کہ عرض کیا گیا' اندرونِ ملک عرب انقلابِ محمدیؐ کی تکمیل ہوگئی۔

حج کے انتظامات.....آنحضور ﷺ کی حکمت عملی

غلبۂ دین حق کی تکمیل کے بعد بھی آپؐ نے حج کے معاملے میں خصوصی حکمت عملی اختیار فرمائی۔ ۸ھ میں جب حج کا موقع آیا تو آپؐ نے سابق انتظام کو برقرار رکھا۔ مشرکین کو نہ صرف یہ کہ حج کرنے کا پورا موقع دیا بلکہ حج کا پورا انتظام بھی انہی کے ہاتھوں میں رہنے دیا۔ اگلے سال یعنی ۹ھ کے حج میں ایک تبدیلی کی گئی۔ مشرکین کو بھی

اگرچہ اہل ایمان کے ساتھ حج کرنے کی اجازت برقرار رکھی گئی لیکن حج کے انتظامات کی ذمہ داری اب مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی۔ اس موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضور ﷺ نے امیر الحج مقرر فرمایا تھا۔ چنانچہ آپؓ کی زیرِ امارت سن نو ہجری کا حج ادا ہوا۔ اسی موقع پر سورۂ براءۃ (سورۃ التوبۃ) کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں جن میں مشرکین مکّہ کو آخری الٹی میٹم دیا گیا تھا۔ ان آیات کے نزول سے قبل حضرت ابوبکرؓ قافلۂ حج لے کر روانہ ہو چکے تھے۔ حضور ﷺ نے حضرت علیؓ کو بھیجا کہ میرے ذاتی نمائندے کی حیثیت سے اجتماع میں ان آیات کو پڑھ کر سناؤ اور اللہ کی جانب سے مشرکین سے براءت کا اعلان کر دو۔ حضرت علیؓ جب حضور ﷺ کے حکم کی تعمیل میں حضرت ابوبکرؓ کے پاس پہنچے تو انہوں نے حضرت علیؓ سے جو پہلا سوال کیا وہ ہمارے لئے بظاہر بڑا عجیب ہے۔ لیکن اس کا ذکر یہاں اسی لئے کیا جا رہا ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ حضور ﷺ نے جو اجتماعی نظام تشکیل دیا تھا اس میں ڈسپلن کی اہمیت کس قدر تھی۔ حضرت علیؓ کو دیکھتے ہی حضرت ابوبکرؓ نے پہلا سوال یہ کیا کہ: ''اَمِیْرٌ اَوْ مَاْمُوْرٌ؟'' (امیر بن کر آئے ہو یا بطورِ مامور آئے ہو؟) یعنی کیا حضورؐ نے آپؓ کو قافلۂ حج کا امیر معین کر کے بھیجا ہے یا امارت کی ذمہ داری بدستور مجھ پر ہے؟ حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ امیر آپ ہی ہیں' میں مامور کی حیثیت سے آیا ہوں' تاہم بات صرف اتنی ہے کہ حضورؐ کے ذاتی نمائندے کی حیثیت سے اس اجتماعِ حج میں یہ آیات براءۃ مَیں پڑھ کر سناؤں گا۔ اس خدمت پر مجھے نبی اکرم ﷺ نے مامور فرمایا ہے۔

﴿بَرَاءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴾

مشرکین عرب کے لئے آخری الٹی میٹم

سورۂ براءۃ کی یہ ابتدائی آیات درحقیقت اس بات کا اعلانِ عام ہے کہ اب جزیرہ نمائے عرب میں کفر اور شرک کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ اب تو صورت یہ ہے کہ: ﴿جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ﴾ ''حق آ گیا اور باطل نیست و نابود ہو چکا ہے''۔

چنانچہ اعلان کر دیا گیا کہ اشہرِ حرم کے ختم ہوتے ہی مشرکین کا قتلِ عام شروع کر دیا جائے: ﴿فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ﴾ ''پس جب محترم مہینے ختم ہو جائیں تو قتل کرو مشرکین کو جہاں بھی انہیں پاؤ!'' اب اس جزیرہ نمائے عرب میں کفر اور شرک کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ صرف اہلِ کتاب کو یہ ایک اختیار دیا گیا کہ وہ اگر چاہیں تو چھوٹے ہو کر رہ سکتے ہیں: ﴿يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ﴾ ''وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں اور چھوٹے ہو کر رہیں''۔ یعنی وہ اگر چاہیں تو اپنے مذہب پر عمل پیرا رہیں' اپنے نجی معاملات میں وہ نصرانیت یا یہودیت پر برقرار رہنا چاہیں تو رہیں' لیکن اب یہاں اللہ کا دین غالب ہو گا اور انہیں اس کی بالادستی کو قبول کرنا ہو گا۔ مشرکین عرب یعنی بنی اسماعیل کو یہ رعایت نہیں دی گئی' اس لئے کہ حضور ﷺ ان ہی میں سے تھے۔ آپؐ کی اوّلین بعثت ''اُمّیین'' ہی میں تھی۔ انہی کی زبان بولتے ہوئے آپؐ تشریف لائے' آپؐ اسی قوم میں سے تھے۔ گویا کہ مشرکین عرب پر اللہ کی طرف سے اتمامِ حجت بدرجہ آخر اور بتمام و کمال ہو چکا' لہٰذا ان کے لئے اب کوئی رعایت اور کوئی گنجائش نہیں!!

ہجرت کے دسویں سال نبی اکرم ﷺ نے بنفسِ نفیس فریضۂ حج ادا فرمایا اور ہجرت کے بعد یہی آپؐ کا پہلا اور آخری حج ہے۔ اس میں آپؐ نے وہ خطبہ ارشاد فرمایا جو تاریخ کے اوراق میں نمایاں طور پر ثبت ہے۔ عرب کے کونے کونے سے آئے ہوئے سوا لاکھ سے زائد افراد میدانِ عرفات میں جمع تھے۔ گویا آپ ﷺ کی ۲۳ سالہ محنت توڑ دینے والی مساعی کا حاصل آپؐ کے سامنے گوش بر آواز تھا۔ اس موقع پر آپؐ نے حاضرین سے یہ گواہی بھی لے لی کہ میں نے حق تبلیغ ادا کر دیا' تبلیغ کا جو بارِ گراں مجھ پر ڈالا گیا تھا میں نے اس کا حق ادا کر دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ سے بھی یہ عرض کر کے کہ ''اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ'' (اے اللہ! تو بھی گواہ رہ کہ میں نے تبلیغ کا حق ادا کر دیا) آپؐ نے اطمینان کا سانس لیا۔ گویا اس عظیم ذمہ داری کا بوجھ آپؐ کے کاندھوں سے اتر گیا۔

سورۃ الفتح کی آخری آیات کے درس میں یہ مضمون ہمارے مطالعے سے گزر چکا

ہے کہ:

﴿هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا﴾

آیت کے آخری الفاظ کہ ''اور کافی ہے اللہ بطورِ گواہ'' کا ربط جڑ جاتا ہے حضور ﷺ کے اس فرمان سے کہ ''اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ'' اے اللہ تو گواہ رہ کہ اس جزیرہ نمائے عرب پر تیرے دین کا غلبہ مکمل ہو گیا۔

بیرونِ عرب دعوتی سرگرمیاں

یہ تو معاملہ تھا اندرونِ ملک عرب کا' اب آیئے اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ بیرونِ عرب صورتِ حال کیا تھی۔ جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے' آنحضور ﷺ دو بعثوں کے ساتھ مبعوث ہوئے۔ آپؐ کی بعثت خصوصی اہلِ عرب کی طرف تھی اور بعثتِ عمومی پوری نوعِ انسانی کی طرف ﴿اِلٰی كَافَّةِ النَّاسِ﴾ اس بعثتِ عمومی کے ضمن میں بھی نبی اکرم ﷺ نے اپنے فرائض کی ادائیگی کا آغاز اپنی حیاتِ طیبہ میں فرما دیا تھا اور پھر ان فرائض کو اُمت کے حوالے کر کے آپؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے' جبکہ بعثتِ خصوصی کی ذمہ داری کل کی کل آپؐ نے بنفسِ نفیس ادا فرمائی۔ چنانچہ حجۃ الوداع کے موقع پر اس کی تکمیل کا اعلان بھی اللہ کی جانب سے ہو گیا۔

﴿اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا﴾

بعثتِ عمومی کے ضمن میں آغازِ کار کے طور پر آنحضور ﷺ نے جو اقدامات کئے ان کا ایک خاکہ ذہن میں جما لیجئے! صلح حدیبیہ ۶ ھ میں ہوئی' اور اس کے بعد آپؐ نے آس پاس کے حکمرانوں کی طرف دعوتی خطوط لکھے۔ حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور ﷺ کا نامہ مبارک لے کر خسرو پرویز کے دربار میں پہنچے۔ اس بدبخت نے آپؐ کے نامۂ مبارک کو چاک کر دیا اور انتہائی گستاخی کی روش اختیار کی۔ وہ تو یہ سمجھتا تھا کہ عرب کا سارا علاقہ اس کی سلطنت میں شامل ہے اور عرب میں رہنے

والے سب اس کی رعیت ہیں۔ چنانچہ اس نے یمن کے ایرانی گورنر کو حکم بھیجا کہ (معاذ اللہ نقل کفر کفر نباشد) یہ کون گستاخ شخص ہے جس نے مجھے خط لکھنے کی جرأت کی ہے' اس کو فوراً گرفتار کر کے میرے دربار میں حاضر کرو! ..... وہاں سے دو اشخاص خسرو پرویز کے حکم کی تعمیل میں آپؐ کے پاس مدینہ پہنچے کہ ہمارے بادشاہ نے آپ کو طلب فرمایا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا میں تمہاری بات کا جواب کل دوں گا۔ اگلی صبح آپؐ نے ان دونوں کو بلا کر فرمایا کہ جاؤ تمہارا ربّ (بادشاہ) قتل ہو چکا ہے۔ اور فی الواقع اسی رات وہ اپنے بیٹے کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔ آپؐ کے یہ الفاظ بھی تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہیں کہ خسرو پرویز نے میرا خط چاک نہیں کیا' اپنی سلطنت کے ٹکڑے اڑا دیئے ہیں۔ اور وہ سلطنت واقعتاً نسیاً منسیا ہو کر رہی۔

قیصر روم ہرقل کے دربار میں آپؐ کا نامۂ مبارک لے کر حضرت دِحیہ کلبی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پہنچے۔ وہ شخص اہلِ کتاب میں سے تھا' نصرانی تھا' صاحبِ علم تھا۔ اس کو یہ پہچاننے میں دیر نہیں لگی کہ یہ وہی رسول ہیں جس کے ہم منتظر تھے۔ لیکن حکومت اور سلطنت کی بیڑیاں اس کے پاؤں میں پڑی ہوئی تھیں لہٰذا وہ ایمان لانے سے محروم رہا۔ تاہم اس نے بھرپور کوشش کی کہ پوری سلطنت اسی طرح اجتماعی طور پر اپنا مذہب تبدیل کر کے اسلام لے آئے جیسے اس سے قبل ایک بار اپنے شہنشاہ کی پیروی میں پوری سلطنت نے عیسائیت کو اختیار کر لیا تھا۔ چنانچہ اس نے دربار لگایا۔ ان دنوں بیت المقدس کے نزدیک غزہ شہر میں حضرت ابوسفیان جو ابھی تک ایمان نہیں لائے تھے' تجارتی قافلہ لے کر پہنچے ہوئے تھے۔ انہیں قیصر روم کے دربار میں طلب کیا گیا۔ بھرے دربار میں جو گفتگو ہوئی اس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ قیصر چاہتا کیا تھا! ہرقل نے اپنے سوالات کے ذریعے یہ کوشش کی کہ ان کے جواب سن کر درباریوں پر یہ بات واضح ہوتی چلی جائے کہ آپؐ نبی برحق ہیں' آپ ہی رسول آخر الزماں ہیں۔ (یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ حضرت ابوسفیان نے جو اُس وقت مشرکین کے قافلے کے سردار تھے' ہر سوال کے جواب میں صحیح بات بتائی اور غلط بیانی سے گریز کیا) لیکن

اس کے درباریوں اور خاص طور پر بطارقہ یعنی عیسائی پادریوں کا ردِّعمل نہایت مخالفانہ تھا۔ طیش کے عالم میں ان کے نتھنوں میں سے خرخراہٹیں نکل رہی تھیں۔ ہرقل نے محسوس کیا کہ اس طرح تو اس کا تخت اقتدار ڈول جائے گا' لہٰذا ایمان سے محروم رہا۔

اسی طرح مصر کا حکمران مقوقس بھی عیسائی تھا۔ اس کے پاس جب آپ ﷺ کا نامۂ مبارک پہنچا تو اسے بھی پہچاننے میں دیر نہیں لگی۔ اس نے جان لیا کہ آپؐ نبی برحق ہیں۔ اس نے آپؐ کے ایلچی کا احترام کیا' کچھ تحفے تحائف بھی حضورؐ کی خدمت میں بھیجے۔ لیکن ایک شخص شرحبیل بن عمرو نے جو رؤساء شام میں سے تھا اور قیصر روم کے زیر اثر سمجھا جاتا تھا' گستاخی کی انتہا کر دی۔ اس کی جانب حضرت حارث بن عمیرؓ حضور ﷺ کے ایلچی کے طور پر آپؐ کا نامۂ مبارک لے کر گئے۔ شرحبیل بن عمرو نے انہیں شہید کر دیا۔ یہ واقعہ مملکت روم کے ساتھ اسلامی ریاست کے تصادم کی بنیاد بن گیا۔

سلطنتِ روم کے ساتھ تصادم کا آغاز

سفیر کا قتل بین الاقوامی اخلاقیات میں ایک بہت بڑا جرم تصور کیا جاتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ان کے قصاص کے لئے تین ہزار کا ایک لشکر تیار کیا اور اسے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زیر کمان شام کی طرف روانہ کیا۔ یہاں سے گویا اب بیرونِ عرب تصادم کا آغاز ہو گیا۔ آنحضور ﷺ نے پیشگی طور پر یہ ہدایت دے دی تھی کہ اگر حضرت زیدؓ شہید ہو جائیں تو پھر کمان حضرت جعفر طیارؓ کے ہاتھ میں ہو گی' وہ بھی اگر شہید ہو جائیں تو پھر عبداللہ بن رواحہؓ لشکر کے امیر ہوں گے۔ ادھر سے شرحبیل بن عمرو ایک لاکھ کی فوج کے ساتھ مقابلے پر آیا۔ یہاں اب مشورہ ہوا' تین ہزار کا ایک لاکھ کے ساتھ مقابلہ ہے' جنگی نقطہ نگاہ سے کوئی نسبت اور تناسب نہیں بنتا۔ آیا لوٹ جائیں یا آگے بڑھیں اور ٹکرا جائیں ..... !! مسلمانوں کا ذوقِ شہادت اور جذبۂ جہاد غالب آیا۔ فیصلہ ہوا کہ نہیں' فتح و شکست کے بارے میں سوچنا ہمارا کام نہیں' ہمیں تو اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ مقابلہ ہوا۔ یکے بعد دیگرے حضرت زید بن حارثہ' حضرت جعفر طیار اور حضرت عبداللہ بن رواحہ تینوں شہید ہو گئے' رضی اللہ تعالیٰ عنہم وارضاہم

اجمعین۔ اور پھر کمان ہاتھ میں لی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اور ایک نہایت خونریز جنگ کے بعد جیسے بھی بن پڑا' بڑی حکمت اور مہارت کے ساتھ اس لشکر کو دشمن کے نرغے سے نکال کر لے آئے۔ جب یہ لشکر مدینے واپس پہنچا تو بعض لوگوں نے اس خیال سے کہ یہ بھگوڑے ہیں اور جان بچا کر میدانِ جنگ سے بھاگ آئے ہیں' لشکر پر باقاعدہ خاک پھینکی۔ نبی اکرم ﷺ نے اس سے منع فرمایا بلکہ اس لشکر کے دفاع میں سورۃ الانفال ہی کے الفاظ کا حوالہ دیا کہ یہ بھاگ کر آنے والے نہیں ہیں بلکہ ان کا یہ عمل تو ﴿مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ﴾ (یعنی جنگی حکمتِ عملی کے تحت دوسری فوج سے جا ملنے کے لئے پیچھے ہٹنا) کے زمرے میں آئے گا' اس لئے کہ یہ لوگ اپنی جماعت کی طرف لوٹ کر آئے ہیں تاکہ ایک نئی تیاری کے ساتھ اور پورے اہتمام کے ساتھ از سرِ نو حملہ کیا جا سکے۔

غزوۂ تبوک۔ نہایت کٹھن آزمائش

اس کے بعد نبی اکرم ﷺ نے نفیر عام کا اعلان فرما دیا۔ اعلانِ عام کر دیا گیا کہ اب وقت ہے کہ سب لوگ اللہ کے راستے میں نکلیں۔ اللہ کے دین پر ایک کٹھن مرحلہ آ گیا ہے' وقت کی عظیم ترین قوت سلطنتِ روما کے ساتھ تصادم درپیش ہے۔ آج کی اصطلاح میں ہم یوں کہیں گے کہ سپر پاورز میں سے ایک کے ساتھ تصادم ہو رہا ہے۔ لہٰذا ہر شخص اللہ کی راہ میں نکلے۔ سیرت میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس طرح نفیر عام کی گئی۔ یہ ہجرت کا نواں سال تھا۔ سخت گرمی کا موسم تھا۔ تبوک کی جانب پیش قدمی کرنی تھی جو مدینہ سے چھ سات سو میل کی مسافت پر تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ قحط کا سا عالم تھا اور اب کھجور کی فصل پک کر تیار تھی۔ اندیشہ تھا کہ اگر سب لوگ یہاں سے چلے گئے تو ان فصلوں کو اتارنے والا کوئی نہ ہوگا اور یہ برباد ہو جائیں گی۔ پھر یہ کہ ٹکراؤ کس سے ہے؟ سلطنتِ روما سے! اب تک تو مسلمانوں کا مقابلہ اپنے ہم پلہ عربوں کے ساتھ تھا۔ مسلمان خود عرب تھے اور ان کے مقابلے میں بھی عرب قوت تھی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ افواج کی تعداد اور سامانِ حرب کے لحاظ سے ایک اور دس کی نسبت تھی۔

لیکن یہ کہ عرب کا تصادم سلطنتِ روما کے ساتھ.....! کوئی نسبت تناسب بنتا ہی نہیں۔ یہ وہ وقت ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دوران اہلِ ایمان کے ایمان کی آخری اور سب سے کڑی آزمائش ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ توبہ میں تفصیل کے ساتھ اس سفرِ تبوک میں پیش آنے والے حالات و واقعات کا ذکر بھی ہے اور ان پر ایک مفصل تبصرہ بھی وارد ہوا ہے۔ سیرتِ طیبہ میں اس غزوے کو جہاد و قتال فی سبیل اللہ کا نقطۂ عروج قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ تیس ہزار کا لشکر لے کر محمد رسول اللہ ﷺ مدینہ سے روانہ ہوئے اور ایک نہایت طویل اور پُرصعوبت سفر طے کر کے تبوک پہنچے۔ (سیرت کی کتابوں میں اس مہم کو ''جیش العُسرۃ'' یعنی ''نہایت سختی اور تنگی کا لشکر'' کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے) تبوک میں آپؐ نے بیس دن قیام فرمایا۔ ہرقل قیصر روم وہاں سے کچھ دور زیادہ فاصلے پر نہیں تھا' قریب ہی موجود تھا۔ لاکھوں کی تربیت یافتہ افواج (Standing armies) اس کے ساتھ تھیں۔ لیکن وہ مقابلے کی ہمت نہ کر سکا' بلکہ طرح دے گیا' مقابلے پر آنے سے گریز کیا۔ یہ ایک سوالیہ نشان ہے مؤرخین کے سامنے کہ اس کی وجہ کیا ہوئی؟ نبی اکرم ﷺ بیس دن تک تبوک میں مقیم رہے۔ پورے علاقے پر آپؐ کی دھاک بیٹھ گئی۔ مسلمانوں کا رعب اور دبدبہ قائم ہو گیا۔ آس پاس کے رؤساء نے آ کر اطاعت قبول کی اور اس طرح گویا کہ بیرونِ ملک عرب اسلام کی دعوت اور اس کے پھیلاؤ کا نقطہ آغاز ہو گیا' لیکن ہرقل سامنے نہیں آیا۔ اس کی واحد وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ وہ جانتا تھا کہ مقابلے پر اللہ کے رسولؐ ہیں' ان کے ساتھ ٹکرانے کا نتیجہ اس پر خوب عیاں تھا' لہٰذا وہ طرح دے گیا اور مقابلے میں نہ آیا۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

اہم اعلان

قارئین نوٹ فرمالیں کہ حکمت قرآن کا آئندہ شمارہ ''عہد حاضر میں اسلامی ریاست اور معیشت کے چند بنیادی مسائل'' کے موضوع پر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے مضامین پر مشتمل ہوگا اور اس کی حیثیت اگست اور ستمبر ۲۰۰۲ء کے مشترکہ شمارے کی ہوگی۔

درس سورۃ التغابن
ایمان اور اس کے ثمرات و مضمرات

حافظ عاکف سعید

کے دو خطاباتِ جمعہ کی تلخیص

گزشتہ خطاب جمعہ میں محترم ڈاکٹر صاحب نے سورۃ المنافقون بیان فرمائی تھی۔ سورۃ المنافقون کے فوراً بعد سورۃ التغابن ہے جس کا موضوع ایمان ہے۔ گویا قرآن نے "تُعْرَفُ الْاَشْیَاءُ بِاَضْدَادِھَا" کے اصول کے مطابق پہلے نفاق کی حقیقت کو واضح کیا' پھر ایمان کی۔ سورۃ التغابن کے پہلے رکوع میں ایمان کی اصل حقیقت' ایمانیاتِ ثلاثہ یعنی ایمان باللہ' ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرۃ کا بہت ہی عمدگی سے بیان ہے۔ پہلے رکوع کی دس میں سے سات آیات میں انہی کا تذکرہ ہے جبکہ تین آیات میں ایمان کی دعوت ہے۔ دوسرے رکوع کی آٹھ آیات میں سے پہلی پانچ میں ایمان کے ثمرات و نتائج' ایمان کے مضمرات اور ایمان کے نتیجے میں انسان کے رویئے' عمل اور سوچ میں جو تبدیلی پیدا ہونی چاہئے اس کا ذکر ہے اور پھر آخری تین آیات میں ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے بھرپور دعوت ہے۔ واقعتاً ایمانیات کے مباحث کا بڑی عمدگی سے اس سورۂ مبارکہ میں خلاصہ آ گیا ہے۔ گویا یہ ہمارے لئے اللہ کی طرف سے ایک بہت بڑا تحفہ ہے کہ اگر اس ایک سورۃ کو پڑھ لیں تو ایمان کا خلاصہ سامنے آ جاتا ہے۔

اس سورۂ مبارکہ کا ترجمہ کرنے سے پہلے میں چاہوں گا کہ ایک بار پھر آپ ذہن میں تازہ کر لیں کہ ایمان کیا ہے؟ تَصْدِیْقُ بِمَا جَاءَ بِہِ النَّبِیُّ ﷺ یعنی اس بات کی تصدیق کرنا جو نبی اکرم ﷺ لے کر آئے ہیں۔ اس تصدیق کے بھی دو پہلو ہیں' ایک

زبان سے اقرار کرنا اور ایک دل سے یقین۔ حقیقی ایمان' دلی یقین والا ایمان ہے جو اللہ کے ہاں معتبر ہے اور جس کی بنیاد پر آخرت میں فیصلے ہوں گے۔ ہاں اقرارِ لسانی دنیا میں اہمیت رکھتا ہے۔ قانونی اعتبار سے کسی شخص کو مسلمان سمجھنے کے لئے ہمیں اس کے قول پر انحصار کرنا پڑتا ہے' لیکن جو اصل ایمان ہے' جسے قرآن ایمان کہتا ہے وہ تصدیق قلبی والا ایمان ہے۔ اب اگلے مرحلے پر آیئے کہ نبی اکرم ﷺ نے جو خبریں دی ہیں وہ کیا ہیں؟ وہ اصل میں اس کائنات کی ultimate realities ہیں۔ یعنی وہ حقائق جن تک ہمارا ذہن صرف عقل کی رہنمائی میں نہیں پہنچ پاتا اور وہ سوالات جن کے جواب کی تلاش میں فلاسفر دیواروں سے اپنا سر ٹکرا رہے ہیں' ان کے اصل' یقینی اور صحیح جواب کا نام ایمان ہے۔ جس کے انسان کے باطن میں اشارات موجود ہیں۔ اسی لئے جب رسول ان سوالوں کا جواب دیتا ہے تو انسان محسوس کرتا ہے کہ یہی حق ہے۔ یہ باطنی گواہی اندر سے پھوٹتی ہے' جب کہ فلسفی آپ کو گورکھ دھندے اور منطقی موشگافیوں میں الجھا کر اگر ایک نتیجے تک پہنچاتا ہے تو وہ خود بھی تذبذب کا شکار ہوتا ہے۔ پڑھنے والا بھی اس کے بارے میں حیران و پریشان ہوتا ہے کہ اس کو مانوں یا نہ مانوں' شاید دلیل منطقی طور پر تو صحیح ہو لیکن ذہن کو اپیل نہیں کر رہی۔ بہرحال اس سورۃ کے پہلے حصے میں آپ کو ان ultimate questions کا جواب ملے گا۔ چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝﴾

''اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہے ہر وہ شے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے' اُسی کی حکومت ہے' اُسی کا اختیار ہے' اُسی کے لئے کل شکر اور تعریفیں ہیں' اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

نبی اکرم ﷺ جس اللہ کو ماننے کی دعوت دے رہے ہیں وہ ہستی وہ ہے کہ کائنات کا ہر ذرہ اور زمین و آسمان کی ہر شے اس کی تسبیح میں مشغول ہے۔ اور تسبیح کیا ہے؟ اللہ کے بارے میں یہ احساس کہ وہ ہر عیب' نقص' کمی اور کوتاہی سے پاک اور مبرا ہے۔ چنانچہ کائنات کا ہر ذرہ اپنے وجود سے اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ میرا

خالق ایک ذاتِ باکمال ہے۔ اس میں کوئی عیب نہیں' کوئی نقص نہیں' کسی اعتبار سے کوئی کمی اور کوتاہی نہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ اختیار اور اقتدار بھی اُسی کا ہے' پوری کائنات میں اُسی کا سکّہ رواں ہے' اسی کا حکم جاری وساری ہے۔ انسان کو تھوڑی سی غلط فہمی اس لئے ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے معاملے میں دیکھتا ہے کہ میرے پاس تو اختیار ہے' میں چاہوں تو ''اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی'' کا دعویٰ کر دوں' جو جی چاہے قانون بناؤں' سیاہ و سفید کا مالک بن جاؤں۔ لیکن یہ بہت بڑا مغالطہ ہے' کیونکہ خود انسان اپنے وجود پر بھی بہت سے اعتبارات سے قدرت نہیں رکھتا۔ وہ اپنی بڑھتی ہوئی عمر کو روک نہیں سکتا۔ اسی طرح وہ یہ تو جان لے گا کہ اسے فلاں بیماری لاحق ہے لیکن ہر بیماری پر قابو پانا اس کے لئے ممکن نہیں ہے۔ موت کا تو کوئی علاج تجویز ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا سارا اندرونی نظام اللہ کے حکم سے چل رہا ہے' اس کا کوئی کنٹرول اس کے پاس نہیں۔ وہ اس بارے میں بھی کوئی اختیار نہیں رکھتا کہ اس نے کہاں پیدا ہونا ہے اور کس رنگ کے ساتھ پیدا ہونا ہے۔ وہ تو خود اللہ کے نظام میں جکڑا ہوا ہے۔ لیکن اللہ نے اس کو ایک معنی میں اختیار دیا ہے تاکہ اُسے آزمائے۔ یہ دنیا دراصل دارالامتحان ہے اور اس امتحان کا تقاضا یہ تھا کہ انسان کو کچھ نہ کچھ اختیار دیا جاتا اور پھر دیکھا جاتا کہ وہ کدھر جا رہا ہے' اِمَّا شَاکِرًا وَّاِمَّا کَفُوْرًا۔ حقیقت کے اعتبار سے اللہ ہی کی حکومت ہے' اسی کا اختیار ہے' اس لئے تعریف بھی اُسی کی ہے' شکر بھی اُسی کا ہے۔ اسی طرح وہ ہر چیز پر قادر ہے' اس کا اختیار ہر شے پر محیط ہے۔ آگے فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ فَمِنْکُمْ کَافِرٌ وَّمِنْکُمْ مُّؤْمِنٌ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝﴾

''وہی ہے جس نے تم سب کو پیدا کیا' پھر تم میں کوئی کافر ہے اور کوئی مؤمن۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس کو دیکھتا ہے''۔

''هُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ'' کے الفاظ میں ایک اہم سوال کا جواب مل گیا کہ ہم از خود پیدا نہیں ہوئے' کوئی ہمارا خالق ہے۔ یہ کائنات لگے بندھے قوانین کے تحت خود بخود

نہیں چل رہی ہے کہ کچھ اتفاقات کے نتیجہ میں کوئی چیز ظہور پذیر ہوگئی اور پھر اس کے اندر کچھ اصول خود بخود بن گئے۔ ایسا نہیں ہے' بلکہ وہی اللہ تمہارا خالق ہے جس کی تسبیح و تحمید میں کائنات کا ہر ذرہ مشغول ہے' جس کا اختیار و اقتدار پوری کائنات پر ہے۔ ہاں تمہارا معاملہ یہ ہے کہ تم میں سے بعض اُس کا انکار کرتے ہیں' لیکن کچھ لوگ وہ بھی ہیں جو اُس پر ایمان رکھتے ہیں۔ انسان کو اللہ نے بنایا ہی اس لئے ہے کہ اسے امتحان میں ڈالا جائے' لہٰذا کچھ اختیار دیا ہے' اور اس اختیار کو جو انسان ناجائز طور پر استعمال کر رہا ہے وہ اپنے خالق کا انکار کرنے پر تلا ہوا ہے' لیکن اس سے وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا' سارا نقصان اسی کا اپنا ہے۔ یہ اختیار بھی اللہ ہی کا دیا ہوا ہے کہ کوئی ایمان لائے یا کوئی انکار کرے۔ لیکن اس choice کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہاں اندھیر نگری ہے کہ جو چاہو کرو اور سب کا انجام ایک سا ہے۔ اس غلط فہمی میں نہ رہنا! اگر اس نے یہ اختیار دیا ہے تو وہ تم پر کڑی نظر بھی رکھے ہوئے ہے۔ آخرت میں انسان کے اعمال پر ہی جزا و سزا کا معاملہ ہوگا۔ لہٰذا جو قدم بھی اٹھاؤ سوچ سمجھ کر اٹھاؤ۔ اگلی آیت میں اس بات کو مزید واضح فرمایا:

﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۞﴾

''اُس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا حق کے ساتھ' اور اُسی نے تمہاری صورت گری کی اور کیا ہی عمدہ صورت گری کی' اور اُسی کی طرف تمہیں لوٹ کر جانا ہے''۔

یہاں اس سوال کا جواب بھی مل گیا کہ کائنات کیوں پیدا کی گئی ہے۔ دراصل بہت سے ایسے مذاہب یا ایسے فلسفے دنیا میں رہے ہیں جن کا نقطۂ نظر تھا کہ کائنات کے کوئی خالق یا کچھ دیوتا ہیں تو سہی' لیکن انہوں نے اپنی تفریح طبع کے لئے یہ کائنات بنائی ہے جسے وہ آسمان پر بیٹھے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ انسانوں کا باہم دست و گریباں ہونا' یہاں کی ہنگامہ آرائی کا وہ نظارہ کر رہے ہیں۔ اس آیت میں اس تصور کی نفی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اللہ نے اس زمین و آسمان کو ایک مقصد' ایک حکمت کے تحت پیدا

کیا ہے۔ اور وہی ہے جس نے تمہاری صورت گری کی۔ ویسے تو پوری کائنات اللہ کی مصوری کا شاہکار ہے' لیکن خاص طور پر انسان اس بارات کا دولہا ہے۔ اس انسان کو اللہ نے اپنے دست قدرت سے پیدا کیا۔ یہ اللہ کی خلاقی کا ایک عظیم شاہکار ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انسان اپنی عظمت سے غافل ہے۔ بہرحال اس بات کا ایک نتیجہ نکلتا ہے کہ جب اللہ نے پوری کائنات کو با مقصد پیدا کیا اور اس کائنات کے سلسلۂ تخلیق کا نقطۂ عروج انسان ہے تو کیا اسے ایسے ہی پیدا کر دیا کہ کھائے پیئے' عیش کرے اور مر جائے اور قبر کی مٹی ظالم اور مظلوم سب کو برابر کر دے' کسی کا گریبان پکڑنے والا کوئی نہ ہو' کسی کا محاسبہ کرنے والا کوئی نہ ہو؟ — ایسا نہیں ہے' بلکہ ایک دن وہ تم سے تمہارے ہر عمل کا حساب لے گا۔ اب آگے بہت اہم بات بیان کی جا رہی ہے:

﴿يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾

''جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے وہ سب جانتا ہے' اور جو کچھ تم چھپا کر کرتے ہو اور جو کھلم کھلا کرتے ہو اس سے بھی آگاہ ہے' اور اللہ دلوں کے بھیدوں سے بھی واقف ہے''۔

اب تم کہو کہ بروز قیامت جو کچھ ہم کہیں گے یا جو ہم statement دیں گے یا جو بظاہر ہمارا طرزِ عمل ہوگا اس کے مطابق حساب ہو جائے گا تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ تمہاری نیتیں کیا ہیں' ارادے کیا ہیں' بظاہر کارِ خیر کر رہے ہو اصل مقصد کیا تھا' زبان سے عشقِ رسولؐ کے دعوے ہیں دل میں کیفیت کیا تھی' وہ سب سے واقف ہے' کوئی چیز اُس سے مخفی نہیں۔ اور وہ اپنے علمِ کامل کی بنیاد پر حساب لے گا۔ یہ اللہ کی صفت علم ہے جسے یہاں تین انداز سے بیان کیا گیا۔ ''وہ جانتا ہے جو کچھ کہ آسمانوں اور زمین میں ہے۔'' اپنی جگہ بات مکمل ہے' لیکن مزید مؤکد کرنے کے لئے فرمایا: ''جو کچھ تم چھپا کر کرتے ہو اسے بھی جانتا ہے اور جو تم علانیہ کرتے ہو اُس سے بھی واقف ہے۔'' لیکن ایک اس سے اگلا مرحلہ بھی ہے کہ ''اللہ ان باتوں کو بھی جانتا ہے جو تمہارے سینوں میں

مخفی ہیں''۔ اس سے کیا مراد ہے؟ بعض اوقات اپنے کسی عمل کے بارے میں انسان کو خود معلوم نہیں ہوتا کہ میرے اس عمل کا محرک کیا ہے؟ شعوری طور پر وہ نہیں جانتا' کیونکہ کچھ چیزیں اس کے لاشعور میں بھی ہوتی ہے جس سے وہ خود بھی پورے طور پر واقف نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان چیزوں سے بھی واقف ہے۔ یہ ہے اس کا علم کامل جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔

اب تک چار آیات میں توحید کا بیان تھا' یا یوں کہیے کہ اللہ کا تعارف یا ultimate questions کا جواب ایک حد تک مکمل ہوا۔ اب ایمان بالرسالت کا ذکر آ رہا ہے۔ فرمایا:

﴿اَلَمۡ یَاۡتِکُمۡ نَبَؤُا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ قَبۡلُ ۫ فَذَاقُوۡا وَبَالَ اَمۡرِهِمۡ وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ۝﴾

''کیا تم تک خبریں نہیں پہنچیں ان لوگوں کی جنہوں نے تم سے پہلے کفر کیا تھا' تو انہوں نے اپنی بداعمالیوں کا مزہ چکھ لیا' اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔''

قومِ عاد' قومِ ثمود' آلِ فرعون کا جو حشر ہوا کیا اس کی خبریں ہم تک نہیں پہنچیں؟ ذرا سوچو ان کا انجام کیا ہوا؟ دنیا میں ان پر عذابِ ہلاکت آیا۔ لیکن یہ نہیں کہ اس طرح ان کا حساب برابر ہو گیا بلکہ آخرت میں ایک دردناک عذاب بھی ان کا منتظر ہے۔ یہ کیوں ہوا؟ آگے اس کا جواب دیا گیا:

﴿ذٰلِکَ بِاَنَّهٗ کَانَتۡ تَّاۡتِیۡهِمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ فَقَالُوۡۤا اَبَشَرٌ یَّهۡدُوۡنَنَا ۫ فَکَفَرُوۡا وَتَوَلَّوۡا وَّاسۡتَغۡنَی اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ غَنِیٌّ حَمِیۡدٌ۝﴾

''یہ اس لئے کہ ان کے پاس اللہ کے بھیجے ہوئے رسول واضح اور روشن تعلیمات لے کر آئے تو وہ کہنے لگے کہ کیا اب (ہمارے جیسے) آدمی ہماری رہنمائی کریں گے؟ چنانچہ انہوں نے انکار کیا اور منہ موڑ لیا تو اللہ بھی بے پروا ہو گیا۔ اور اللہ تو ہے ہی بے نیاز اور اپنی ذات میں محمود''۔

رسول کے انکار کا اصل سبب کچھ اور ہوتا ہے' لیکن منکرین نے کوئی بہانہ تراشنا ہوتا ہے' مثلاً یہی کہ ہمارے جیسا انسان نبی نہیں ہو سکتا۔ اگر اللہ نے کسی کو بھیجنا تھا تو کسی فرشتے کو بھیجتا جو آسمان سے اترتا ہوا ہمیں نظر آتا اور اس کے ہاتھ میں کتاب ہوتی' یا

ہم تو اسے نبی مانیں گے جس کے دائیں بائیں فرشتے چل رہے ہوں' یہ ہمارے جیسا انسان ہماری رہنمائی پر کیسے فائز ہو گیا' یہ ہم ماننے کو تیار نہیں۔ یہ انکار کا بس ایک بہانہ ہے' حالانکہ دِل کہتا ہے کہ نبی جو بات کہہ رہے ہیں صحیح کہہ رہے ہیں' اس لئے کہ مطابق فطرت بات ہے۔ ویسے بھی رسول کا کردار خود بہت بڑی شہادت ہے۔ رسول اچانک کہیں سے نہیں ٹپکا ہے۔ اس نے انہی کے درمیان زندگی گزاری ہے' وہیں پل بڑھ کر جوان ہوا ہے۔ یہ اس کے بے داغ کردار سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی استغنا کی روش اختیار کی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا میں ان پر عذاب ہلاکت آیا اور پوری قوم نسیاً منسیا کر دی گئی۔ یہ ایمان بالرسالت کی اہمیت ہے۔ اس پر گویا اہلِ عرب کو بھی خبردار کر دیا گیا کہ تم سے پہلے بڑی بڑی تہذیبوں اور بڑی بڑی اقوام نے جب رسولوں کا انکار کیا تو دنیا میں ان کا یہ حشر ہوا' جبکہ اصل عذاب ابھی بعد میں آئے گا۔ اور اللہ بے نیاز ہے' اگر کوئی اللہ پر ایمان نہیں لاتا' ناشکری کرتا ہے تو اس سے اللہ کے نظام میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ جو ایسا کر رہا ہے وہ اپنا ہی نقصان کر رہا ہے۔ اللہ تو غنی ہے' اسے کسی کی احتیاج نہیں اور وہ حمید ہے' اس کی حمد اپنے آپ ہو رہی ہے۔ اگلی آیت میں ایمان بالآخرۃ کا ذکر ہے۔ فرمایا:

﴿زَعَمَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ یُّبْعَثُوْا ؕ قُلْ بَلٰی وَرَبِّیْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ؕ وَذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ﴾

'' کافروں کو یہ گمان ہے کہ وہ اٹھائے نہیں جائیں گے۔ کہئے کیوں نہیں' میرے ربّ کی قسم! تم ضرور اٹھائے جاؤ گے' پھر تمہیں لازماً آگاہ کیا جائے گا اس سے کہ جو تم کرتے رہے' اور یہ اللہ کے لئے آسان ہے''۔

مشرکین عرب کہتے تھے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ جب ہم مر جاتے ہیں' ہماری ہڈیاں بھی گل سڑ کر پیوند خاک ہو جاتی ہیں تو ہمیں پھر دوبارہ زندہ کیا جائے! یہ ناممکن ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ یہ ان کی خام خیالی ہے اور یہ اللہ پر بہت آسان ہے۔ وہ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ہے۔ گندے پانی کی بوند سے جس نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا وہ تمہیں دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہے۔ عقل انسانی بھی کہتی ہے کہ اگر کسی نے ایک دفعہ کوئی کام کیا ہے تو

دوسری مرتبہ اس کام کا کرنا اس کے لئے آسان ہوتا ہے۔ جس نے پہلی مرتبہ تخلیق کیا ہے تو کیا وہ دوبارہ تخلیق نہیں کرسکتا۔

اب اس رکوع کی آخری تین آیات میں دعوتِ ایمان ہے۔ دیکھو اگر یہ سب باتیں سمجھ میں آ گئیں، واقعی دل نے گواہی دے دی، وہ جو ultimate questions تھے ان کے جوابات تمہیں مل گئے اور اس پر دل ٹھک گیا کہ ہاں یہی حق ہے اور اس کیفیت کے ساتھ تمہارے دل نے اسے قبول کیا ہے تو پھر اب کوئی تعصب، کوئی ضد اور دنیا کا کوئی مفاد آڑے نہیں آنا چاہئے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِیْٓ اَنْزَلْنَا ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ۝﴾

''پس ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور اُس نور (یعنی قرآن) پر جو ہم نے نازل کیا، اور جو تم کرتے ہو اللہ اس سے خوب باخبر ہے''۔

اس میں ایک تنبیہ اور warning بھی ہے کہ اگر نہیں مانتے تو اللہ جانتا ہے کہ کیوں نہیں مان رہے اور تمہارے دل میں کیا پوشیدہ ہے۔ چنانچہ آگے فرمایا:

﴿یَوْمَ یَجْمَعُكُمْ لِیَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ یَوْمُ التَّغَابُنِ ؕ وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَیَعْمَلْ صَالِحًا یُّكَفِّرْ عَنْهُ سَیِّاٰتِهٖ وَیُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ۝﴾

''اور جس دن کہ اللہ جمع کرے گا تم سب کو اور وہ جمع کرنے کا دن (یعنی ہار جیت کا دن) ہوگا۔ اور جو اللہ پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے اللہ اس سے اس کی برائیاں دور کردے گا اور اسے ایسی جنتوں میں داخل کردے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، ہمیشہ ہمیش اس میں رہیں گے۔ اصل میں یہی بڑی کامیابی ہے''۔

قیامت کے دن کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ وہ دن ہار اور جیت کے فیصلے کا دن ہوگا۔ اس میں یہ بات بین السطور موجود ہے کہ یہ دنیاوی زندگی ایک امتحان ہے۔ یہ آزمائشی وقفہ ہے۔ یہاں کی جیت یا ہار حقیقی جیت یا ہار نہیں ہے بلکہ وہ بھی اسی امتحانی عمل کا ایک حصہ ہے۔ یہاں انسان ایک بار ناکام ہو جائے تو پھر محنت کر کے کامیاب

ہوسکتا ہے' لیکن یہ ناکامی یا کامیابی ناپائیدار اور عارضی ہے' اس کی کوئی حقیقت ہے ہی نہیں۔ یہ دنیا میں جو کچھ اونچ نیچ ہے یہ دراصل اللہ کی طرف سے امتحان ہے۔ آخری فیصلہ جو کامیابی یا ناکامی کا حقیقی فیصلہ ہوگا وہ قیامت کے دن میدانِ حشر میں ہوگا۔ وہاں کی کامیابی اصل کامیابی ہوگی۔ اور جو وہاں ناکام ہوگیا وہ اصل خسارے میں ہے۔ اس دن ناکام وہ ہوگا جس نے کفر کیا۔ لہٰذا فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ﴾

''اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا یہی لوگ اہل جہنم ہیں' وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے' اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے''۔

یہ جھٹلانا قول سے بھی ہوسکتا ہے کہ میں قرآن کو نہیں مانتا' لیکن ایک تکذیب عملی ہے کہ قرآن تو خوب پڑھ رہے ہیں' حصولِ ثواب کے لئے بھی' ایصالِ ثواب کے لئے بھی' لیکن اس پر عمل کرنے کو تیار نہیں۔ جو ہدایت قرآن نے دی ہے اسے اختیار کرنے کو تیار نہیں۔ یہ بھی تکذیب ہے۔ تو فرمایا کہ جن لوگوں نے ناشکری کی اور ہماری آیات کی تکذیب کی یہ لوگ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے' اور بہت برا ہے یہ انجام۔ اسی ہار اور جیت کو قرآنِ مجید میں بڑے جامع انداز میں سورۂ آلِ عمران (آیت ۱۸۵) میں بھی بیان کیا گیا' جہاں کامیابی اور ناکامی کو دوٹوک انداز میں واضح کر دیا گیا۔ فرمایا: ﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۭ﴾ ''جو شخص جہنم کی آگ سے بچا لیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا وہ کامیاب ہے''۔ دنیا میں چاہے دُنیوی معیارات کے اعتبارات سے وہ بہت ہی ناکام ہو۔ دنیا کی زندگی تو بہرحال گزر جائے گی' اصل زندگی تو آخرت کی ہے۔ یہاں کوئی شخص فاقوں سے رہتا ہو' کوئی مکان' کوئی جھونپڑی اس کے لئے نہ ہو' لیکن اس نے ایمان اور عمل صالح کے تقاضوں کو پورا کیا تو اصل کامیاب وہ ہے۔ اور اگر کسی کے پاس قارون کی دولت ہو' فرعون جیسا اقتدار ہو' بظاہر بڑا کامیاب ہو' لیکن اگر ایمان اور عمل صالح کے تقاضوں کو پورا نہیں کیا تو وہ آخرت

میں ناکام قرار پائے گا۔

اب آیئے دوسرے رکوع کا مطالعہ کرتے ہیں۔ دوسرے رکوع میں ایمان کے اثرات اور نتائج کا بیان ہے۔ یعنی جب ایمان کسی شخص کے باطن میں سرایت کر جائے' اس کا سینہ نورِ ایمانی سے جگمگا اٹھے تو اس کی سوچ' اس کے فکر اور اس کے طرزِ عمل میں ایک بہت بڑا انقلاب واقع ہو جاتا ہے۔ سورۂ تغابن کے دوسرے رکوع کی آٹھ آیات میں سے پہلی پانچ میں ایمان کے اثرات' نتائج اور مضمرات کا ذکر ہے اور آخری تین آیات میں ان پر عمل کی دعوت۔ جیسے پہلے رکوع کی آخری تین آیات میں ایمان کی دعوت تھی دوسرے رکوع کی آخری تین آیات میں ایمان کے عملی تقاضوں کو پورا کرنے کی دعوت ہے۔ فرمایا:

﴿مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ ؕ وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰہِ یَھْدِ قَلْبَہٗ ؕ وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ﴾

''نہیں پڑتی کوئی مصیبت مگر اللہ کے اذن سے' اور جو اللہ پر ایمان لائے تو اللہ اس کے دل کو ہدایت بخشتا ہے' اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے''۔

دیکھئے جب ہم نے مانا کہ اللہ تعالیٰ ہی مالک ہے' خالق ہے' اُس کے اذن کے بغیر کائنات میں ایک پتا تک جنبش نہیں کر سکتا' وہ ہر چیز پر قادر ہے' وہ ہر شے کا جاننے والا ہے' تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کائنات میں جو واقعہ بھی ظہور پذیر ہوتا ہے وہ اللہ کے علم میں ہے اور اللہ کے اذن سے ہو رہا ہے۔ جو یہ یقین کامل رکھتا ہو اللہ اس کے دل کو ہدایت دے دیتا ہے۔ دراصل جو اللہ کا ماننے والا ہے' اللہ پر یقین رکھنے والا ہے' اسے معلوم ہے کہ میرا ربّ مجھ سے بڑھ کر میرا خیر خواہ ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے اللہ کے اذن سے ہو رہا ہے تو جو حال بھی ہو سرِ تسلیم خم ہے۔ وہ راضی برضائے رب کی کیفیت میں رہتا ہے۔ بندۂ مؤمن کو یہ یقین ہوتا ہے کہ مجھے تو معلوم نہیں کہ میری خیر کس میں ہے لیکن میرا ربّ اس سے خوب واقف ہے۔ لہٰذا جو سچا صاحبِ ایمان ہے اسے یقین ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کے پردے میں کوئی نہ کوئی خیر ہی پنہاں ہوگا۔ یہ ہے ہدایت اور قلبی

سکون واطمینان جو قارون جیسی دولت سے بھی نہیں مل سکتا۔ یہ نعمت بغیر ایمان کے نہیں ملتی۔ اس کا فائدہ کیا ہے؟ سورۃ الحدید میں اس بات کو زیادہ کھولا گیا۔ فرمایا: ﴿لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَا اٰتٰكُمْ﴾ ''تاکہ تم افسوس نہ کیا کرو ان چیزوں پر جو تمہارے ہاتھ سے جاتی رہیں اور اس پر پھول نہ جاؤ جو کہ اللہ تمہیں عطا فرمائے۔''

اگر کوئی موقع ہاتھ سے نکل گیا یا کسی قریبی عزیز کی جدائی کا صدمہ دیکھنا پڑا تو اس پر ایک فوری افسوس تو انسان کی فطرت کا حصہ ہے لیکن اسے دل سے لگا لینا غلط ہے۔ کسی نقصان پر مؤمن کا دل مطمئن ہوتا ہے کہ جو کچھ ہوا اللہ کے اذن سے ہوا۔ بندۂ مؤمن جانتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے بغرضِ امتحان ہے۔ بظاہر کوئی سختی یا تکلیف آئی ہے تو وہ بھی میرے لئے آزمائش ہے اور اگر کوئی خیر ہے جسے ہم خیر سمجھتے ہیں اور کوئی فضل ہے جسے ہم فضل سمجھ رہے ہیں تو وہ بھی آزمائش کے طور پر ہے۔ گویا ایمان کا پہلا نتیجہ راضی برضائے ربّ رہنا ہے۔ آگے فرمایا:

﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ﴾

''اللہ کی اطاعت کرو اور رسول (ﷺ) کی اطاعت کرو، پھر اگر تم سرتابی کرو گے تو ہمارے رسول کے ذمہ تو صاف طور پر پہنچا دینا ہے''۔

ایمان کا ایک اور لازمی نتیجہ جسے ہم عام طور پر نظر انداز کرتے ہیں وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی کامل اطاعت ہے۔ سیدھی سی بات ہے جب اللہ کو ربّ مانا ہے تو اس کی کامل اطاعت درکار ہے، اور اسی طرح اللہ کی اطاعت رسول ﷺ کی اطاعت کے واسطے سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ معاملہ نہیں کہ ہر شخص کو براہِ راست وحی بھیجے۔ اس نے ایک کو نمائندہ بنایا، اب جو اللہ کے اس نمائندے کی اطاعت کر رہا ہے وہ اصل میں اللہ کی اطاعت کر رہا ہے۔ آگے بڑی سخت وارننگ ہے کہ اگر تم اطاعت سے روگردانی کرو گے تو جان لو کہ ہمارے رسول کے ذمہ تو صاف صاف پہنچا دینا ہے۔ مطلب یہ کہ اطاعت سے گریز اللہ کے یہاں پکڑ کا باعث بن جائے گا۔ اگلی آیت میں ایمان کا ایک اور نتیجہ بیان کیا جا رہا ہے:

﴿اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾

''دیکھو اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں اور اہل ایمان کو اللہ ہی پر توکل کرنا چاہئے''۔

توکل کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان اسباب و وسائل کو بالکل چھوڑ دے۔ توکل کے ضمن میں حضور ﷺ نے جو رہنمائی دی اس کے بارے میں بڑی پیاری حدیث ہے کہ ایک شخص مسجد نبوی میں داخل ہوا تو اس سے پوچھا گیا کہ تم نے اپنے اونٹ کو باندھ لیا ہے؟ اس نے کہا نہیں میں نے تو اللہ پر توکل کیا ہے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''پہلے اس کا گھٹنا باندھو پھر اللہ پر توکل کرو''۔ یعنی جو اسباب ہیں وہ ضرور فراہم کرو۔ سورۃ الانفال میں بھی حکم ہے کہ دشمن کے مقابلے کے لئے جتنا جنگی سامان بھی ممکن ہو سکتا ہے فراہم کرو' البتہ توکل یہ ہے کہ بھروسہ ان اسباب پر نہ ہو کہ یہ چیز مجھے بچا لے گی' بچانے والا اللہ ہے۔ حنین کے دن تقریباً چودہ ہزار مسلمان آنحضور ﷺ کے ساتھ تھے۔ بعض کے دل میں یہ خیال آ گیا کہ کبھی ہم ۳۱۳ ہوتے تھے اور دشمن ہم پر غالب نہیں آتا تھا' آج تو ہم چودہ ہزار ہیں' فتح یقیناً ہماری ہوگی۔ یعنی بھروسہ تعداد پر ہوا۔ اس پر اللہ کی طرف سے آزمائش آئی اور دشمن نے تیروں کی وہ بوچھاڑ کی کہ بھگدڑ مچ گئی۔ حضور ﷺ کے ساتھ گنتی کے چند لوگ رہ گئے۔ ایک مرتبہ تو پورا شکست کا نقشہ تھا' بعد میں پھر اللہ کی مدد آئی' لیکن اس طرح گویا مسلمانوں کو سبق سکھا دیا گیا کہ توکل اسباب اور تعداد پر نہیں بلکہ اللہ پر ہونا چاہئے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اپنا جائزہ لینا چاہئے کہ کمی کہاں ہے' کیونکہ توکل علی اللہ ایمان کا لازمی نتیجہ ہے۔ آگے فرمایا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ﴾

''اے اہل ایمان! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں تمہارے دشمن ہیں' تو ان سے بچتے رہو''۔

اگر اولاد اور بیوی کی محبت اللہ کی محبت پر غالب آ جائے اور اس کی وجہ سے انسان حلال و حرام کی تمیز بھلا بیٹھے' اور یہ محبت انسان کی عاقبت برباد کرنے کا موجب بن رہی ہو تو یہ دشمنی ہے جس کا تمہیں احساس ہی نہیں ہے۔ ایمان کے جو نتائج ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہ جان لو کہ بیوی اور اولاد جن سے تم سب سے بڑھ کر محبت کرتے ہو

یہی تمہارے لئے سب سے بڑا خطرہ ہیں' لہٰذا ان سے خبردار رہو! چنانچہ ایک مؤمن ان کی فطری محبت کے باوجود ان کے لئے اپنی عاقبت خراب نہیں کرتا۔ البتہ اسی آیت کے اگلے حصّے میں اسے بیلنس کیا کہ:

﴿وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾

''اور اگر تم عفو و درگزر سے کام لو اور چشم پوشی کیا کرو تو اللہ بھی بخشنے والا مہربان ہے''۔

اگر تمہیں یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ بیوی اور اولاد کی محبت میں بالقوۃ میرے لئے دشمنی کا پہلو موجود ہے تو اب یہ نہیں کہ ان کے خلاف گھر کے اندر ایک محاذ بن جائے' تھانیداری والا معاملہ ہو جائے' گھر میدانِ جنگ کا نقشہ پیش کرنے لگے۔ اس طرح تو پھر محبت کی جو مطلوب اور مثبت فضا ہے جس میں کہ اولاد کی پرورش پانا چاہئے وہ تہہ و بالا ہو جائے گی۔ لہٰذا یہ بات ذہن میں رکھو کہ اگرچہ یہ محبت تمہارے لئے خطرہ ہے مگر تمہارا طرزِ عمل عفو و درگزر اور چشم پوشی والا ہو۔ نفسیاتی اعتبار سے بھی آپ کو معلوم ہے کہ اگر کسی شخص کی ہر غلطی پر ٹوکنے لگیں تو اس میں ضد پیدا ہو جائے گی۔ اصلاح کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ توجہ بھی دلایئے لیکن کسی وقت چشم پوشی بھی کیجئے' کبھی سنی اَن سنی بھی کر دیجئے۔ اللہ کا طریقہ بھی یہی ہے' وہ رحیم ہے' کریم ہے' وہ بخشنے والا ہے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہیں اس کی بخشش سے حصّہ ملے تو تم بھی بیوی اور اولاد کے ساتھ نرمی کرو' ان سے درگزر کیا کرو' ان کی خطاؤں کو معاف کر دیا کرو۔ اب اس ضمن میں آخری آیت آ رہی ہے:

﴿اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ﴾

''ایک بات اور سمجھ لو کہ تمہاری اولاد اور مال تمہارے لئے فتنہ ہیں' اور اللہ ہی کے پاس اجرِ عظیم ہے''۔

ابھی تک ذکر ہوا تھا علائق دُنیوی میں بیوی اور اولاد کا' اب ایک اور اعتبار سے مال و دولت دنیا کا بھی ذکر آ رہا ہے۔ وہ جو اقبال نے کہا ہے ؎

یہ مال و دولت دُنیا' یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا الٰہ الا اللہ!

فرمایا یہ مال اور اولاد فتنہ ہے۔ فتنہ سے مراد کسوٹی یا آزمائش ہے جس پر انسان کو پرکھا

جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں وہ چیزیں جو انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہیں' یعنی مال اور اولاد کی محبت' ان کا تذکرہ کیا ہے۔ اولاد بھی ایک طرح سے انسان کی investment ہوتی ہے کہ بڑھاپے میں سہارا بنے گی۔ لہٰذا مال اور اولاد کو یہاں جمع کیا گیا کہ جان لو! ان دونوں کے ذریعے تمہاری آزمائش ہو رہی ہے۔ یعنی انسان اولاد پر اگر اس توقع میں محنت کر رہا ہے کہ بڑھاپے میں سہارا بنے گی تو اس کی توقع درست نہیں۔ امید لگانی ہے تو اللہ سے لگاؤ' کیونکہ بہترین اجر وہی دے سکتا ہے۔ اس دنیا میں ہو سکتا ہے کہ جو توقعات تم نے اولاد سے وابستہ کی تھیں وہ پوری نہ ہوں اور مایوسی ہو' لیکن جو تمہاری محنت کا اجر دے سکتا ہے وہ اللہ ہے۔

اب اس کے بعد آخری تین آیات میں دعوتِ عمل ہے کہ اب عمل کے لئے پیش قدمی کرو۔ فرمایا:

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾

''پس جہاں تک ہو سکے اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور سنو اور اطاعت کرو اور انفاق کرو' یہ تمہارے لئے بہتر ہے' اور جو شخص جی کے لالچ سے بچا لیا گیا تو ایسے ہی لوگ کامیاب ہیں''۔

اگر یہ ساری بات سمجھ میں آ گئی ہے تو آگے بڑھو اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو' کیونکہ یہ ایمان باللہ کا لازمی تقاضا ہے۔ سورۂ آل عمران کی ایک معروف آیت میں تقویٰ کی تاکید سب سے زیادہ ہے' جہاں فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾ ''اے اہلِ ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا اس کے تقویٰ کا حق ہے۔'' یعنی تقویٰ اتنی اہم چیز ہے۔ تقویٰ ہے کیا؟ اللہ کی ناراضگی سے بچنا' معصیت سے بچنا' اللہ کی نافرمانی سے بچنا' گناہوں سے بچنا' اس طرزِ عمل یا رویے کا نام تقویٰ ہے۔ تقویٰ انسان شعوری طور پر اختیار کرتا ہے کہ مجھے اللہ کی نافرمانی سے بچنا ہے۔ لہٰذا وہ اب جو قدم بھی اٹھائے گا پھونک پھونک کر اٹھائے گا۔ قرآنِ مجید سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان جس قدر یہ طرزِ عمل اختیار کرتا ہے اس کا ایمان اتنا ہی بلند ہوتا ہے۔ مقامِ

احسان تک پہنچنے کے لئے اصل قوتِ محرکہ یہی تقویٰ ہے۔

یہ جو فرمایا کہ ''سنو اور اطاعت کرو'' اس کا ایک تعلق ایمان بالرسالت کے ساتھ بنتا ہے۔ کیونکہ شخصی اعتبار سے آنحضور ﷺ اللہ کے نمائندے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ ﷺ کی زبان سے جو حکم نکل رہا ہے اس حکم کو اگر معمولی سمجھا تو پھر رسالت پر ایمان محض دعویٰ ہے۔ ایمان بالرسالت کا تقاضا ہے کہ رسول جو حکم دے' چاہے بات سمجھ میں آ رہی ہے یا نہیں آ رہی' اس پر سرِ تسلیم خم کیا جائے۔ مؤمن کے لئے حکم ہے کہ سنو اور اطاعت کرو۔ یہی روش پھر ایک اسلامی معاشرے میں درکار ہے کہ اسلامی ریاست کا سربراہ یا کسی دینی ادارے یا جماعت کا جو سربراہ ہے اس کے حکم کو بھی سنا اور مانا جائے' لیکن ایک فرق کے ساتھ کہ رسول اپنی ذات میں مطاع ہے' وہ جو بھی حکم دیں گے وہ اللہ کی طرف سے ہوگا۔ لہٰذا ان کا ہر حکم معروف کے درجے میں ہے' لیکن آپؐ کے بعد کسی کا یہ مقام نہیں ہے' لہٰذا کسی امیر کی اطاعت معروف کے دائرے کے اندر ہو گی۔ اگر اولی الامر معروف کے دائرے کے اندر حکم دے' یعنی امیر کا حکم اللہ اور اس کے رسول کے کسی حکم سے متصادم نہ ہو تو پھر ماننا پڑے گا۔ یہ جماعتی نظم ہے جو اسلام نے عطا کیا ہے۔ اس لئے کہ مسلمان ایک نظریاتی اُمت ہیں جن کے سامنے شہادت علی الناس کا ایک عظیم مشن ہے۔ اس اُمت نے اللہ کا پیغام بقیہ نوعِ انسانی تک پہنچانا ہے۔ یعنی جو کام رسول اللہ ﷺ نے کیا وہ ختم نبوت کی وجہ سے اب اُمت کو کرنا ہے۔ اس کے لئے سمع و طاعت والا نظم ضروری ہے۔ باقی جہاں تک نظم حکومت ہے اس میں مشاورت کی اپنی جگہ اہمیت ہے' لیکن طرزِ عمل یہ ہو کہ اطاعت کرنی ہے۔

اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ اللہ کے دین کے لئے خرچ کرو' اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ اس کا تعلق ایمان بالآخرۃ کے ساتھ ہے۔ کیونکہ اگر انسان کو یقین ہے کہ اصل گھر آخرت کا ہے تو وہ کوشش کرے گا کہ ساری کمائی وہاں کے لئے بچ جائے۔ بڑی سادہ سی مثال ہے کہ جو لوگ مڈل ایسٹ وغیرہ میں کام کرتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ ان کا اصل گھر پاکستان ہے۔ وہ وہاں جو کچھ کماتے ہیں اس کا کم سے کم اپنے اوپر

خرچ کرتے ہیں باقی سارا بچا کر رکھتے ہیں یا گھر بھیجتے ہیں کہ واپس جا کر کاروبار شروع کرنا ہے یا مکان بنانا ہے۔ اسی طرح اگر آخرت پر یقین ہے کہ اصل گھر وہ ہے تو اس دنیا میں انسان کی کوشش یہ ہوگی کہ وہاں کے لئے زیادہ سے زیادہ سامان جمع کرے اور یہاں کم سے کم پر اکتفا کرے۔ اگر یہیں سب کچھ لگا دیا اور وہاں کے لئے کچھ نہ بچایا تو بہت ہی خسارے کا معاملہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص اپنے جی کے لالچ سے بچا لیا گیا وہ بامراد ہوا۔ کیونکہ لالچ، حرص اور بخل دین کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ ہیں۔

چنانچہ آگے فرمایا:

﴿اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ﴾

''اگر تم اللہ کو قرضِ حسنہ دو گے تو وہ تمہیں کئی گنا بڑھا کر دے گا اور تمہیں معاف فرما دے گا، اور اللہ بڑا قدر دان اور بردبار ہے''۔

جو مال خدمت دین اور غلبہ و اقامت دین کی جدوجہد کے لئے خرچ کیا جائے اس کا بہت اونچا مقام ہے۔ جو کچھ بھی تم خرچ کرو گے گویا وہ اللہ کو قرض دو گے۔ حالانکہ ایک اعتبار سے دیکھیں تو مال اُسی نے عطا کیا تھا، اگر اس کی راہ میں خرچ کر دیا تو یہ حق بحقدار رسید کے مصداق ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی قدردانی ہے کہ اسی کا مال تم اس کے راستے میں خرچ کرتے ہو تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے ذمہ قرض سے تعبیر فرما رہے ہیں اور اس کو وہ بڑھا چڑھا کر مسلسل اضافے کے ساتھ تمہیں واپس لوٹائیں گے۔

آگے فرمایا:

﴿عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾

''وہ جاننے والا ہے غیب کا بھی، حاضر کا بھی (چھپی باتوں کا بھی اور کھلی باتوں کا بھی) وہ زبردست اور غالب ہے (اسی کی حکومت جاری و ساری ہے) اور وہ کمال حکمت والا ہے''۔

بارك الله لي ولكم في القرآن العظيم ونفعني وإياكم بالآيات والذكر الحكيم ٥٥

انسانی اعضاء کی پیوندکاری

تحریر: چوہدری خالد نذیر

دورِ جدید میں طبی علوم بالخصوص سرجری کے میدان میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے اوراب انسانی اعضاء کی تبدیلی ایک عام سی چیز تصور کی جانے لگی ہے۔لیکن کوئی بھی چیز اللہ بزرگ و برتر کے بنائے ہوئے دستور وقواعد سے ہٹ کر کی جائے تو اس کا لازمی نتیجہ گوناگوں مشکلات کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔مغربی ممالک جو اِس جدید علمی ترقی کا منبع ہیں، وہاں کم ازکم یہ شعور موجود ہے کہ اگر کسی چیز کے نتائج غلط نکلیں تو اس بارے میں جلد از جلد حدود و قیود طے کر کے واپسی کا راستہ اختیار کیا جاتا ہے۔

الحمد للہ ہم مسلمانوں کو یہ صورت درپیش نہیں ہے۔اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کتاب ہدایت کے ذریعے ایسے اصول وقوانین عطا فرمائے ہیں کہ یہ دستورِ حیات ابد تک رہنمائی کرنے کے لئے کافی ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اس دستورِ حیات کو اپنی زندگی کا حصّہ بنائیں اور تمام معاملات میں اُس کے بتائے ہوئے رہنما اصولوں پر عمل کریں۔

انسانی اعضاء کی پیوندکاری ایک اہم معاملہ ہے، اس سے متعلق باقاعدہ قواعد وضوابط وضع کرنا نہایت ضروری ہے، جس کے لئے لازم ہے کہ اس بارے میں شریعت اسلامیہ سے رجوع کیا جائے اور احکاماتِ الٰہی کی روشنی میں ضوابط معلوم کئے جائیں۔

انسانی اعضاء کی پیوندکاری کی دو صورتیں ہیں:

اولاً: کسی زندہ شخص کا اپنے کسی عضو کا عطیہ کرنا۔

ثانیاً: کسی شخص کا یہ وصیت کرنا کہ اس کے مرنے کے بعد فلاں عضو اُس کے جسم سے نکال کر کسی دوسرے ضرورت مند شخص کو لگا دیا جائے۔

صورت اوّل میں ایک زندہ شخص زندہ حالت میں اپنا کوئی عضو کسی دوسرے شخص کو منتقل کرتا ہے۔اس کے لئے ضروری ہے کہ شریعت اسلامیہ کی روشنی میں انسان کی ذات

اور حیثیت کو معلوم کیا جائے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ولقد کرّمنا بنی آدم......﴾ (الاسراء:۷۰)

''اور بے شک ہم نے اولادِ آدم کو عزت بخشی''۔

نیز فرمایا:

﴿وَلا تُلْقُوا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ﴾ (البقرۃ:۱۹۵)

''اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو''۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((وَمَنْ قَتَلَ نَفْسَہٗ بِحَدِیْدَۃٍ عُذِّبَ بِھَا فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ))(۱)

''جس نے اپنے آپ کو کسی تیز دھار آلے سے قتل کیا اس کو جہنم کی آگ میں اسی (تیز دھار آلے) سے عذاب دیا جائے گا''۔

ایک دوسری جگہ فرمایا:

((کَانَ بِرَجُلٍ جِرَاحٌ فَقَتَلَ نَفْسَہٗ فَقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : بدرنی عبدی بنفسہ حَرَّمْتُ عَلَیْہِ الْجَنَّۃَ))(۲)

''کوئی آدمی زخمی تھا (اس نے اپنے زخموں سے تنگ آ کر) اپنے آپ کو قتل کر ڈالا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: 'میرے بندے نے اپنے لئے مجھ سے جلدی کی' میں نے اس پر جنت حرام کر دی''۔

ابنِ حجر عسقلانی حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کسی شخص کا اپنے نفس کے خلاف جرم ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی دوسرے شخص کے خلاف۔ دونوں کا گناہ برابر ہے' کیونکہ وہ خود اپنے آپ کا مالک نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے' لہٰذا اس میں اس کے لئے تصرف جائز نہیں ہے''۔(۳)

اسی مضمون کی ایک اور حدیث ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلَّذِیْ یَخْنُقُ نَفْسَہٗ یَخْنُقُھَا فِی النَّارِ وَالَّذِیْ یَطْعَنُھَا یَطْعَنُھَا فِی النَّارِ))(۴)

''جو اپنا گلا گھونٹ کر اپنے آپ کو ہلاک کرتا ہے جہنم میں بھی اپنا گلا گھونٹتا رہے گا' اور جو نیزے سے اپنے آپ کو مارتا ہے جہنم میں بھی نیزے سے اپنے آپ کو مارتا رہے گا''۔

نبی کریم ﷺ نے مزید فرمایا:

((قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی : ثَلَاثَةٌ اَنَاخَصْمُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ: رَجُلٌ اَعْطٰى بِیْ ثُمَّ غَدَرَ وَرَجُلٌ بَاعَ حُرًّا فَاَكَلَ ثَمَنَهٗ وَرَجُلٌ اسْتَاْجَرَ اَجِيْرًا فَاسْتَوْفٰى مِنْهُ وَلَمْ يُعْطِ اَجْرَهٗ))(۵)

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تین آدمیوں کا قیامت کے دن میں خود مدّ مقابل ہوں گا: ایک آدمی جس نے میرے نام پر وعدہ کیا' مگر پھر گیا' اور (دوسرا) آدمی جس نے کسی آزاد شخص کو (غلام بنا کر) بیچا اور اس کی قیمت کھائی اور (تیسرا) وہ شخص جس نے کسی کو اجرت پر رکھا' اس سے کام پورا لیا' مگر اجرت ادا نہ کی''۔

فقہاءِ کرام متفقہ طور پر انسانی اعضاء کی بیع وشراء اور استعمال کو حرام قرار دیتے ہیں۔ امام کاسانی فرماتے ہیں:

''اضطراری حالت میں بھی کسی مسلمان کا قتل کرنا یا اس کا کوئی عضو قطع کرنا جائز نہیں''۔(۶)

شرح جامع الصغیر میں ہے:

الانسان مکرم فلا یجوز ان یکون منه شی ء مبتذل(۷)

''انسان مکرم ہے' لہٰذا یہ جائز نہیں کہ اس کی کسی چیز پر تصرف کیا جائے''۔

بیع وشراء

انسان اور انسانی اجزاء کی بیع قطعی حرام ہے۔ بدائع میں ہے:

البیع مبادلة المال بالمال فلا ینعقد بیع الحر لانه لیس بمال(۸)

''شرائط بیع میں سے ہے کہ مبیع مال ہو' کیونکہ بیع کا مطلب مال کے ساتھ مال کا تبادلہ ہے' لہٰذا آدمی کی بیع جائز نہیں' کیونکہ وہ مال نہیں''۔

امام شیبانی فرماتے ہیں:

لا یجوز بیع لبن امرأة فی قدح ولا یجوز بیع شعر الانسان والانتفاع به(۹)

''عورت کے دودھ کی پیالے میں بیع جائز نہیں اور نہ ہی انسانی بالوں کی بیع اور ان سے استفادہ جائز ہے''۔

انسانی اعضاء کی بیع وشراء فقہاء کے نزدیک متفقہ طور پر حرام ہے' اس پر فقہاء کا اجماع ہے۔(۱۰)

عطیہ و ہبہ

انسان اور انسانی اعضاء کی جس طرح خرید و فروخت حرام ہے اسی طرح ہبہ بھی ناجائز ہے۔ بدائع میں ہے:

منها ان یکون مالا متقوما فلا تجوز هبة ما لیس بمال اصلا کالحر والمیتة والدم وصید الحرام والاحرام والخنزیر وغیر ذلک[۱۱]

''ہبہ کی شرائط میں ہے کہ جو چیز ہبہ کی جارہی ہے وہ مال متقوم ہو لہٰذا ایسی چیز کا ہبہ جائز نہیں جو اصلاً مال کی تعریف سے خارج ہو جیسے آدمی، مردار، خون، حرم اور احرام کا شکار اور خنزیر وغیرہ۔

حالت اضطرار میں انسانی اعضاء سے انتفاع

انسانی اعضاء اور گوشت کا استعمال حالت اضطرار میں بھی جائز نہیں۔

وحرم مالک اکل لحم الانسان فی حالة الضرورة ولو کان مهدرا[۱۲]

''امام مالک رحمۃ اللہ کے نزدیک اضطراری حالت میں بھی انسان کا گوشت کھانا حرام ہے اگرچہ وہ آدمی (کسی جرم کی بناء پر) واجب القتل ہی کیوں نہ ہو''۔

المبسوط میں ہے:

المضطر کما لا یباح له قتل الانسان لیاکل من لحمه لا یباح له قطع عضو من اعضاء ہ[۱۳]

''مضطر شخص کے لئے نہ یہ جائز ہے کہ وہ اپنی بھوک مٹانے کے لئے کسی دوسرے شخص کو قتل کرے تاکہ اس کا گوشت کھالے اور نہ یہ جائز ہے کہ وہ اپنے ہی اعضاء میں سے کوئی عضو کاٹ کر کھائے''۔

امام سرخسی مزید فرماتے ہیں:

حرمة الاعضاء کحرمة النفس[۱۴]

''اعضاء کی حرمت، حرمت نفس ہی کی طرح ہے''۔

بزازیہ حاشیہ ہندیہ میں ہے:

مضطر لم یجد میتة وخاف الهلاک فقال له رجل اقطع یدی وکلها او قال اقطع فی قطعة وکلها لا یسعه ان یفعل ذلک لا یصح امره به کما

لایسع للمضطر ان یقطع قطعة من لحم نفسه فیاکل(۱۵)

''ایک شخص جو حالت اضطرار میں ہے اس کے پاس کھانے کے لئے کچھ بھی نہیں' حتیٰ کہ مردار بھی نہیں' ایسی حالت میں اسے ایک شخص کہتا ہے کہ میرا ہاتھ کاٹ کر کھالو (اور اپنی جان بچالو) یا کہے میرے جسم سے کچھ گوشت کا ٹکڑا کاٹ کر کھا لو (اور اپنی جان بچالو) تو اس کا یہ فعل جائز نہیں۔ اسی طرح جو شخص حالت اضطرار میں ہے اس کے لئے یہ بھی جائز نہیں کہ وہ اپنے جسم میں سے اپنے گوشت کا ٹکڑا کاٹ کر کھالے''۔

تداوی اور علاج

اجزاءِ آدمی کا استعمال بطورِ علاج اور تداوی بھی جائز نہیں۔ امام محمدؒ فرماتے ہیں:

لا بأس بالتداوی بالعظم اذ ان کان عظم شاة او بقرة او بعیر او فرس او غیره من الدواب الا الخنزیر والآدمی(۱۶)

''ہڈی کے بطور علاج استعمال میں کوئی حرج نہیں' جبکہ یہ ہڈی کسی جانور کی ہو' جیسے بکری' گائے' اونٹ' گھوڑا وغیرہ' مگر خنزیر اور آدمی کی ہڈی سے علاج جائز نہیں''۔

مذکورہ بالا آیت کریمہ' احادیث شریفہ اور ائمہ فقہ کی آراء سے درج ذیل باتیں قطعی طور پر ثابت ہوتی ہیں:

۱) انسان اپنی ذات میں مکرم' اشرف اور محترم ہے۔

۲) یہ کہ انسان اپنی جان کو ختم نہیں کر سکتا۔ کل کا تلف کرنا جائز نہیں لہٰذا جزء کا تلف کرنا بھی ناجائز ہے' اس لئے خودکشی بالاجماع حرام ہے۔

۳) انسانی شرف و کرامت کی وجہ سے اس کے اعضاء سے بشمول بال اور ہڈیوں سے کسی بھی صورت میں استفادہ و انتفاع حرام ہے۔

۴) انسانی جسم مال کی تعریف سے خارج ہے لہٰذا اس کی بیع و شراء ناجائز ہے۔

۵) جس طرح انسان اور اس کے اعضاء انسانی کی بیع و شراء حرام ہے اسی طرح انسانی اعضاء کا تحفہ یا ہبہ کرنا بھی ناجائز ہے' کیونکہ جس چیز کو ہبہ کیا جائے اس کا مال متقوم کی تعریف سے خارج ہے۔

۶) انسانی اعضاء کا استعمال بطور علاج بھی جائز نہیں' کیونکہ یہ بات انسانی شرف و تکریم

کے خلاف ہے کہ اسے بطور دوا و علاج استعمال کیا جائے۔

۷) اضطرار کی حالت میں بھی کسی انسان کے لئے جائز نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان کا عضو کاٹ کر اپنی جان بچائے۔

مجالس علماء کی آراء اور فیصلے

انسانی اعضاء کی پیوند کاری ایک اہم مسئلہ ہے' لہٰذا اس کے شرعی پہلو پر دَورِ حاضر کی مقتدر مجالس علماء نے مختلف اوقات میں غور و فکر کیا ہے۔ اس بارے میں ان کی آراء' قراردادیں اور فیصلے برائے ملاحظہ پیش ہیں۔

۱) مجلس علماء کراچی

۱۹۶۷ء میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کی زیرِ نگرانی علماء کی اہم مجلس قائم ہوئی جس میں کراچی کی تین ممتاز دینی درس گاہوں' دارالعلوم کراچی' مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیو ٹاؤن اور اشرف المدارس ناظم آباد کراچی کے ماہر اہلِ فتویٰ شریک ہوئے۔ اس مجلس نے ''مریض کو خون دینے اور تبادلہ اعضاء انسانی'' کے مسائل پر غور کے لئے اندرونِ ملک و بیرونِ ملک اہلِ فتویٰ کے پاس سوال نامہ بھیج کر اُن کی تحقیقات جمع کیں اور باہم بحث و تمحیص کے بعد درج ذیل رائے دی:

''اسلام نے ایک انسان کے اعضاء کو دوسرے انسان کے لئے استعمال کرنا اس کی رضامندی اور اجازت کے ساتھ بھی جائز نہیں رکھا اور نہ کسی انسان کو یہ حق دیا ہے کہ وہ اپنا کوئی جزو دوسرے کو معاوضہ پر یا بلا معاوضہ دے دے۔

انسان کو حق تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ کا خاص مظہر بنایا ہے اور اس کے بدن میں بولنے' دیکھنے' سننے' سمجھنے وغیرہ کے لئے ایسی نازک خودکار مشینیں لگا دی ہیں کہ سائنس جدید و قدیم مل کر بھی اس کا کوئی حصہ نہیں بنا سکتی۔

انسان کا وجود درحقیقت ایک چلتی پھرتی فیکٹری ہے جس میں سینکڑوں نازک مشینیں کام کر رہی ہیں۔ یہ سب مشینیں ان کے پیدا کرنے والے نے انسان کو ودیعت و امانت کے طور پر دی ہیں' اس کو ان چیزوں کا مالک نہیں بنایا۔ البتہ امانت کے طور پر دینے والے کریم مولا نے اس کو سرکاری مشینوں کے استعمال کی

ایسی آزادانہ طاقت و اجازت دے دی ہے کہ اس سے اس کو یہ دھوکہ لگ جاتا ہے کہ میں اپنی جان اور اپنے اعضاء کا خود مالک ہوں، مگر حقیقت حال یہ نہیں۔ اسی وجہ سے انسان کے لئے جس طرح خودکشی کرنا حرام ہے اسی طرح اپنا کوئی عضو کسی دوسرے کو رضا کارانہ طور پر یا معاوضہ لے کر دے دینا بھی حرام ہے۔ فقہاء رحمہم اللہ نے قرآن وسنت کی واضح نصوص کی بناء پر فرمایا ہے کہ جو شخص بھوک پیاس سے مر رہا ہے اس کے لئے مردار جانور اور ناجائز چیزوں کا کھانا پینا تو بقدر ضرورت جائز ہو جاتا ہے مگر یہ بات اِس وقت بھی جائز نہیں کہ کسی دوسرے زندہ انسان کا گوشت کھالے اور نہ کسی انسان کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنا گوشت یا کوئی عضو دوسرے انسان کو بخش دے، کیونکہ خرید وفروخت یا بخشش وہدیہ اپنی مِلک میں ہوسکتا ہے، روحِ انسانی اور اعضاءِ انسانی اس کی مِلک نہیں جو وہ کسی کو دے سکے"۔ (۱۷)

۲) اسلامی نظریاتی کونسل، پاکستان

اسلامی نظریاتی کونسل نے ۱۹۸۴ء میں حکومت کے استفسار پر انسانی اعضاء کی تبدیلی و پیوندکاری کے مسئلہ پر درج ذیل رائے کا اظہار کیا:

"۱) نظامِ قدرت میں یہ دخل اندازی کے مترادف ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو تمام اعضاء اور صلاحیتوں کے ساتھ ایک اکائی کے طور پر پیدا کیا ہے۔ اس اکائی میں سے کوئی جزء الگ کرلیا جائے تو یہ اکائی مکمل حالت میں باقی نہیں رہتی، بلکہ ناقص رہ جاتی ہے۔

۲) شریعت کی رو سے انسانی جسم کسی کی ملکیت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ودیعت ہے اور ہر انسان کو اس ودیعت میں قطع و برید کا حق حاصل نہیں اور اس بناء پر فقہاء اسلام میں کوئی فرقہ بھی اس عطیہ کو جائز نہیں سمجھتا۔

۳) زندہ انسانی جسم میں کسی عضو کے قطع کر دینے سے اس جسم کی بحیثیت اکائی صلاحیت کار دائماً متاثر ہوتی ہے۔

۴) اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے دو دو اعضاء میں سے ایک کا عطیہ دے دینے سے مستقبل میں دوسرے عضو کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔

۵) موجودہ مادّی دَور میں انسانی اعضاء کی خرید وفروخت کا مذموم کاروبار شروع

ہو جائے گا جس سے اشرف المخلوقات کا جسم بھی بھیڑ بکریوں کی طرح بکاؤ مال بن کر رہ جائے گا۔ جیسا کہ انسانی خون کا کھلے بندوں کاروبار ہو رہا ہے۔ اسی طرح پاکستان میں متمول حضرات کی طرف سے یہ اشتہارات آ رہے ہیں کہ جو اپنا گردہ دے گا اس کو ایک لاکھ روپیہ معاوضہ دیا جائے گا لہٰذا اسد ذریعہ کے طور پر بھی زندہ انسان کے جسم اور اعضاء کو کاروباری تعامل کا موضوع بننے سے روکنا ضروری ہے۔

جہاں تک (ب) میں مذکورہ صورت کا تعلق ہے کسی میت کی وصیت کے مطابق اس کی موت واقع ہو جانے کے بعد اس کا عضو قطع کیا جا سکتا ہے۔

اس وصیت کی حیثیت اصطلاحی وصیت کی نہیں ہے بلکہ اس سے مراد موصی (وصیت کرنے والا) شخص کی یہ خواہش ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے اعضاء اس کے کام نہیں آئیں گے اور ان سے کسی دوسرے ضرورت مند شخص کو فائدہ ہونے کی توقع ہے۔ اگر اس کی اس خواہش کی تکمیل سے دوسرے شخص کو فائدہ حاصل ہو سکے تو اس کی یہ خواہش اس کے مرنے کے بعد پوری کی جا سکتی ہے''۔ (۱۸)

۳) اسلامی فقہ اکیڈمی' جدّہ

اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ نے فروری ۱۹۸۸ء میں اس بارے میں غور و خوض کے بعد درج ذیل قرارداد منظور کی:

''ایک انسان کے جسم سے دوسرے انسان کے جسم میں ایسے عضو کی منتقلی جائز ہے جو خود بخود دوبارہ وجود میں آتا رہتا ہے' مثلاً خون' کھال وغیرہ۔ (۱۹)

دوسرے الفاظ میں جو اعضاء خود بخود وجود میں نہیں آتے ان کی منتقلی حرام ہے۔

منتقلیٔ اعضاء کے خطرناک نتائج

عملی طور پر منتقلیٔ اعضاء کے انتہائی خطرناک نتائج سامنے آئے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ اس چیز نے ایک کاروبار کی صورت اختیار کر لی ہے' بعض حالات میں اس سے ظلم و تعدی کی دردناک صورتیں سامنے آتی ہیں۔ اس کی کچھ مثالیں پیش خدمت ہیں:

۱) روزنامہ پاکستان

روزنامہ پاکستان' لاہور کی ۲۷ دسمبر ۱۹۹۱ء کی اشاعت میں ''موت کی تجارت''

کے عنوان سے تبدیلیٔ اعضاء کے بارے میں رپورٹ شائع ہوئی جس میں اس معاملے کے مختلف پہلوؤں پر بالتفصیل روشنی ڈالی گئی ہے۔ برائے ملاحظہ پیش ہے:

''جنوبی بھارت میں مدراس کے قریب ملی ولگام گاؤں کی آبادی تین ہزار نفوس پر مشتمل ہے اور یہاں کا ہر بالغ صرف ایک گردے پر جی رہا ہے۔ ظاہر ہے دوسرا گردہ وہ کسی حاجت مند کو فروخت کر چکا ہے۔ یہ انسانی المیہ یعنی انسانی اعضاء کی تجارت ان دنوں بھارت میں خوب عروج پر ہے۔ غربت وافلاس اور بے روزگاری کے مارے لوگ اپنے دکھوں کا علاج منبع حیات یعنی دل کے بعد انسانی جسم کے دوسرے اہم ترین عضو کی فروخت سے کر رہے ہیں۔

طبی سائنس کی ترقی نے ''منتقلیٔ اعضاء'' کو باقاعدہ ایک کاروبار کی شکل دینے میں بڑی مدد کی ہے۔ مثلاً اگر منتقلیٔ اعضاء ممکن نہ ہوتی تو ظاہر ہے کہ بائع ومشتری نہ ہوتے۔ ستم بالائے ستم کہ اس میدان میں انسانی اعضاء کے کمیشن ایجنٹ اور آڑھتی بھی پیدا ہو گئے ہیں۔ بھارتی شہریوں کے گردوں کے سب سے بڑے بلکہ واحد خریدار عرب ہیں۔

لندن سے شائع ہونے والے عربی کے کثیر الاشاعت ہفت روزہ ''المجلہ'' نے اس ضمن میں ایک خصوصی رپورٹ شائع کی ہے جس میں اس نے یہ خوفناک انکشاف کیا ہے کہ بھارت سے گردے خریدنے والے عرب ''موت کی تجارت'' میں ملوث ہیں اور ''ایڈز'' خرید رہے ہیں۔

رپورٹ کی تلخیص:

''ایک تامل ماں نے اپنی بہن کی شادی کے لئے تین ہزار سات سو ڈالر (تقریباً ۹۰ ہزار روپے) میں اپنا ایک گردہ فروخت کر دیا۔ اس میں سے اس نے دس فیصد ''آڑھتی'' کو ادا کئے۔ اس کے خاوند کی کل ماہانہ آمدنی چھ سو روپے ہے۔ اتنی قلیل آمدنی میں اس کے کنبے کے چار افراد گزر بسر کر رہے ہیں۔ اور المیہ یہ ہے کہ زندگی کی ضرورتوں اور حالات سے مجبور ہو کر گردہ بیچنے والی اس خاتون کو صرف ۳۵ یا ۳۶ ہزار روپے ملے۔ باقی درمیانی ''واسطوں'' کی نذر ہو گئے۔ تاہم بھارت میں گردوں کی خرید وفروخت کا یہ کاروبار عالمی حلقوں سے پوشیدہ نہیں ہے اور بین الاقوامی سطح پر یہ آوازیں اٹھنا شروع ہو

گئی ہیں کہ اس غیر انسانی تجارت کو بند کیا جائے۔ بھارت کے سہناذہن نے گردوں کی خرید وفروخت سے فائدہ اٹھانے کا بھی ایک طریقہ دریافت کرلیا ہے۔ انہوں نے بمبئی اور مدراس میں منتقلیٔ گردہ کے بڑے بڑے ہسپتال کھول دیئے ہیں۔ ''گاہکوں'' کو پھنسانے کے لئے (جو ہمیشہ عرب ہوتے ہیں) دلالوں سے کام لیا جاتا ہے جو خصوصی طور پر مشرقِ وسطیٰ کے ملکوں میں بھیجے جاتے ہیں۔ چونکہ عرب ملکوں میں اعلانیہ یا اشتہار سے انسانی اعضاء بشمول گردہ کی خرید وفروخت ممنوع ہے ان کے دلال عرب ملکوں سے ایسے مریضوں کی تلاش کرتے ہیں جنہیں گردہ بدلوانا مطلوب ہوتا ہے' پھر معقول کمیشن کے عوض ان کی اس ضرورت کا ذمہ لے لیا جاتا ہے' یعنی سفر' قیام وطعام' آپریشن' گردے کا حصول وغیرہ وغیرہ۔

بمبئی اور مدراس کے ان ہسپتالوں کی رونق عربوں کے دم قدم سے ہے۔ کاروبار میں سب سے زیادہ نفع میں ہسپتال (جن کے مالکان ہندو ہوتے ہیں) اور سب سے زیادہ گھاٹے میں گردہ دینے والا ہوتا ہے۔ مریض اور کمیشن ایجنٹ مساوی مستفید ہوتے ہیں' لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ گردہ لینے والا ایک نہایت ہی موذی مرض ایڈز کا شکار بھی ہو جاتا ہے۔ بعض طبی رپورٹوں اور اعداد وشمار سے اس المناک حقیقت کا انکشاف ہوا ہے کہ بھارت میں ہونے والے منتقلیٔ گردہ کے بیشتر آپریشن ناکام ہوئے ہیں۔ یہ مریض ہزاروں ڈالر خرچ کرنے کے بعد جب واپس جاتے ہیں تو ان کی حالت پہلے سے بھی خراب ہوتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے بمبئی یا مدراس جا کر گردہ بدلوایا ہے۔ ان کے تفصیلی معائنہ سے یہ ہوشربا انکشاف ہوا ہے کہ نہ صرف یہ کہ گردہ کی پیوندکاری غلط ہوئی ہے بلکہ گردہ ''ایڈز زدہ'' بھی تھا۔ اطباء کے مطابق عرب دنیا میں ''ایڈز'' اس راہ سے بھی داخل ہو رہا ہے''۔ (۲۰)

۲) روزنامہ جنگ' ۲۱ مارچ ۱۹۹۲ء

ایک رپورٹ کے مطابق ''ارجنٹائن کے ایک پاگل خانہ میں مریضوں کے جسمانی اعضاء کاٹ کر بیچ دیئے جاتے ہیں۔ گزشتہ ۱۵ برس کے دوران تقریباً ۱۳۲۱ مریض ہلاک اور ۱۳۹۵ غائب ہو چکے ہیں۔ ایک دن ایک مریض گہرے کنویں میں لٹکا اور گر کر ڈوب

گیا' جب اس کی نعش نکالی گئی تو معلوم ہوا کہ اس کا گردہ کاٹ کر پہلے ہی بیچا جا چکا ہے۔ تفتیش سے معلوم ہوا کہ ہسپتال کا سارا عملہ ہی اس کاروبار میں ملوث ہے جو زندہ مریضوں کا خون' گردے اور دوسرے اعضاء کاٹ کر فروخت کر رہا ہے۔ (۲۱)

۳) ٹائم آف امریکہ' ۵ ستمبر ۱۹۹۴ء

ایشیا واچ کے حوالے سے ٹائم آف امریکہ کی ۵ ستمبر ۱۹۹۴ء کی ایک رپورٹ کے مطابق ''چین میں سزائے موت کے مجرموں کے اعضاء نکال لئے جاتے ہیں جو زیادہ تر گردے اور قرنیہ ہوتے ہیں۔ بیشتر معاملات میں مجرم کی موت واقع ہونے سے قبل ہی یہ اعضاء نکال لئے جاتے ہیں''۔ (۲۲)

ٹائم ہی کی ایک رپورٹ کے مطابق بھارت کے شہر بنگلور میں انسانی اعضاء کے کاروبار نے ایک گھناؤنی شکل اختیار کی ہے۔ یہاں کچھ مزدوروں کو ان سے خون لینے کے بہانے ہسپتال میں داخل کیا گیا اور جب ان کو ہسپتال سے فارغ کیا گیا تو ان پر انکشاف ہوا کہ ان کا ایک گردہ بھی نہیں۔ یعنی اس دوران اُن کو اُن کے ایک گردہ سے بھی محروم کر دیا گیا۔ ان گردوں کو بعد میں ڈاکٹروں کی ملی بھگت سے فروخت کر دیا جاتا ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق شروع میں انسانی اعضاء کی خرید و فروخت کا کاروبار بمبئی تک محدود تھا مگر آہستہ آہستہ بھارت کے دیگر علاقوں تک پھیل گیا۔ غربت کے ہاتھوں تنگ لوگ اپنا ایک گردہ بیچ دیتے ہیں۔ ایک بستی جس میں تقریباً تمام باسیوں نے اپنا ایک گردہ بیچ دیا ہے' کا نام ہی اس سے موسوم کر دیا گیا ہے''۔ (۲۳)

۴) سی این این

امریکی خبروں کے چینل ٹیلی ویژن سی این این کے مطابق بھارت میں ایک ایسی بستی ہے جہاں تمام بالغ باشندے عورت اور مرد صرف ایک گردے پر گزارہ کر رہے ہیں' کیونکہ ایک گردہ اپنی عسرت اور تنگ دستی کے باعث وہ بیچ چکے ہیں اور ان گردوں کے زیادہ تر خریدار عرب شیوخ ہیں۔

ایک رپورٹ کے مطابق اس گھناؤنے کاروبار نے یہاں تک شکل اختیار کی ہے کہ

افریقہ کے غریب ممالک سے بچوں کو خرید کر اُن کے گردے مہنگے داموں بیچ دیئے جاتے ہیں۔ ایسی مثالیں بھی سامنے آئی ہیں کہ بچوں کو اسی مقصد کے لئے گود لیا جاتا ہے کہ ان کے گردے بیچ دیئے جائیں۔

حاصل کلام

۱) انسانی شرف وتکریم کے پیش نظر شریعت اسلامیہ نے انسانی اعضاء سے کسی بھی طور پر انتفاع واستفادہ ناجائز قرار دیا ہے۔ انسانی عضو کا استعمال تداوی اور علاج کی خاطر بھی حرام ہے۔ حالت اضطرار میں بھی کسی انسان کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنی زندگی کی خاطر دوسرے انسان کا عضو قطع کر کے استعمال کرے۔ انسانی اعضاء کی بیع وشراء جائز نہیں' کیونکہ وہ مال کی تعریف سے خارج ہے۔ اسی طرح انسانی اعضاء کا ہبہ یا عطیہ بھی ناجائز ہے' کیونکہ ہبہ اور عطیہ صرف مال متقوم کا جائز ہے' البتہ مرنے کے بعد انسانی قرنیہ اگر دوسرے انسان کے کام آسکے تو اس کی پیوندکاری میں حرج نہیں' جیسا کہ اسلامی نظریاتی کونسل نے اس بارے میں وضاحت کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ عطیہ خون میں حرج نہیں' جبکہ یہ اشد ضرورت کے تحت ہو' البتہ اس کو کاروبار بنانا قطعی ناجائز ہے۔

۲) عملی طور پر اعضاء کی پیوندکاری کے انتہائی خطرناک نتائج سامنے آئے ہیں جن میں بچوں پر ظلم' پاگل مریضوں کے اعضاء کی قطع وبرید' سزائے موت پانے والے افراد کے ساتھ غیرانسانی سلوک نمایاں ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ غربت کے ہاتھوں تنگ لوگ کچھ پیسوں کے حصول کے لئے اپنی زندگیاں بیچنے پر مجبور ہیں۔

۳) طبی نقطۂ نگاہ سے گردہ کی تبدیلی کوئی علاج کے زمرے میں شمار نہیں ہوتی۔ گردہ دینے والا شخص بسا اوقات اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک ہی خاندان دو قیمتی زندگیوں سے محروم ہوگیا۔

۴) اعضاء کی پیوندکاری خطرناک بیماریوں جیسے ایڈز وغیرہ کے پھیلنے کا باعث بن رہی ہے۔

انسانی شرف وتکریم کا تقاضا ہے کہ زندہ انسانوں کے اعضاء کی تبدیلی' کانٹ

چھانٹ اور خرید وفروخت پر مکمل پابندی لگا کر انسان اور انسانی اعضاء کو مالِ تجارت بننے سے روکا جائے' ورنہ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ بعض انسان سستے ہوں گے اور بعض مہنگے۔ آہستہ آہستہ سستے انسانوں کی تمام چیزیں مہنگے انسانوں کو منتقل ہو جائیں گی اور نوبت یہاں تک پہنچے گی کہ ایک مہنگے انسان کو زندہ رکھنے کے لئے کئی سستے انسان خرچ کرنے ہوں گے۔

اقوام متحدہ کے کمیشن برائے انسانی حقوق نے انسانی اعضاء کی خرید وفروخت کو غلامی کی نئی شکل سے تعبیر کیا ہے اور اس کے خلاف جدوجہد کو تیز کرنے کا اعلان کیا ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ شریعت اسلامیہ میں انسانی اعضاء کی کسی بھی غرض سے قطع و برید حرام ہونے کے باوجود وطن عزیز تاحال اس بارے میں کسی ضابطہ وقانون سے محروم ہے۔

حواشی وحوالہ جات

۱) امام عبد الله محمد بن اسماعیل بخاری: صحیح البخاری' کتاب الجنائز' باب ما جاء فی قاتل النفس ۔

۲) ایضاً۔

۳) امام حافظ احمد بن علی بن حجر العسقلانی (۷۷۳۔۸۵۴ھ): فتح الباری' ج۳' ص ۲۲۶'۲۲۷۔ دار نشر الکتب الاسلامیہ' لاہور' پاکستان

٤) صحیح البخاریؒ کتاب الجنائز' باب ما جاء فی قاتل النفس ۔

٥) صحیح البخاری' کتاب البیوع' باب اثم من باع حراً

٦) علامہ علاء الدین ابی بکر بن مسعود الکاسانی: بدائع الصنائع' ج۷' ص ۱۷۷'سعید کمپنی پاکستانی چوک' کراچی

۷) ابو الحسنات عبد الحئی لکھنوی (۱۲۰٤۔۱۲٦٤ھ): النافع الکبیر' شرح الجامع الصغیر' ص ۲۷۰ ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیۃ' کراتشی' پاکستان

۸) بدائع الصنائع' ج٥' ص ۱٤۰

۹) امام ابو عبد اللّٰہ احمد بن الحسن شیبانی (۱۳۲۔۱۸۹ھ): الجامع الصغیر' ص ٤۷۰ ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیۃ' کراتشی' پاکستان

۱۰) علامہ علاء الدین ابو الحسن بن سلیمان المرداوی: الانصاف' ج٤' ص ۲۷۰' احیاء التراث العربی' بیروت' لبنان ۱٤۰۰ھ ۔ علامہ فخر الدین عثمان بن علی الزیلعی: تبیین الحقائق' شرح کنز الدقائق' ج٤' ص ۱۲۔۱۸' مکتبہ امدادیہ ملتان۔ عبدالرحمٰن الجزیری: کتاب الفقه علی مذاهب الاربعة' ج۲' ص ۱٦٤' مکتبہ تجارۃ الکبری' مصر۔ ابن نجیم: البحر الرائق' شرح کنز الدقائق' ج٥' ص ۲٥۹' مکتبہ الماجدیہ' کوئٹہ

۱۱) بدائع الصنائع' ج٦' ص ۱۱۹

۱۲) عبدالقادر عودہ : التشریع الجنائی الاسلامی' ج۱' ص ۵۷۸' دار الحیاء التراث العربی
۱۳) شمس الدین السرخسی: کتاب المبسوط' ج۲٤' ص ٤۸' دار المعرفة للطباعة والنشر' بیروت' لبنان
۱٤) کتاب المبسوط' ج۲٤' ص ٤۸
۱۵) بزازیة حاشیة هندیة' ج۳' ص ٤۰٤
۱٦) بحر الرائق' ج۸' ص ۲۳۳
۱۷) مولانا مفتی محمد شفیع صاحب: انسانی اعضاء کی پیوند کاری شریعت اسلامیه کی روشنی میں' ص ۳۱' ص۲٦۹'۲۷۰ دار الاشاعت' کراچی
۱۸) اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ برائے سال ۱۹۸٤ء حکومت پاکستان۔ نیز ملاحظه هو "رپورٹ استفسارات ۱۹٦۲ء ۔ ۱۹۸٤ء اسلامی نظریاتی کونسل' اسلام آباد پاکستان' ۳۰ مئی ۱۹۸٤ء'ص ۸٦
۱۹) قراردادیں اور سفارشات' اسلامی فقه اکیڈمی جده (۱۹۸٤ء۔ ۱۹۹۲ء) جده' سعودی عرب' ص ۷۳
۲۰) روزنامه پاکستان' لاهور' ۲۷ دسمبر ۱۹۹۱ء
۲۱) روزنامه جنگ' راولپنڈی' ۲۱ مارچ ۱۹۹۲ء
۲۲) هفت روزه ٹائم امریکه' ۵ ستمبر ۱۹۹٤ء
۲۳) هفت روزه ٹائم امریکه' ۲۰ فروری ۱۹۹۵ء

سوانح حضرت مولانا مفتی محمودؒ

تصنیف : مولانا عبدالقیوم حقانی

تذکره وسوانح' سیرت واخلاق' تحصیل علم وتکمیل' درس وافاده' ذوقِ علم اور شوقِ مطالعه' علمی انهماک' زهد وتقویٰ' عشقِ رسولؐ واهتمام سنّت' تواضع وعبدیت' عزیمت وتوکل' بےنفسی وفنائیت' سیاسی بصیرت وعظمت' علمی ودینی اور سیاسی کارنامے' حکمت وبصیرت' لطائف وبذله سنجیاں' مرزائیت کا تعاقب وردِّ فرقِ باطله' اعلاءِ کلمة الله کے لئے جهاد اور مساعی' مسلسل قید وبند کی صعوبتیں۔ الغرض

ایک تاریخ' ایک تحریک اور ایک انقلاب کی داستان

عمده کاغذ' مضبوط جلد بندی اور شاندار طباعت' قیمت صرف 120 روپے

ملنے کا پته: **القاسم اکیڈمی**' جامعه ابوہریره' خالق آباد نوشهره' سرحد پاکستان

امام یحییٰ بن سعید القطانؒ

(۱۲۰ھ — ۱۹۸ھ)

عبدالرشید عراقی

امام یحییٰ بن سعید القطان کا شمار ممتاز تبع تابعین میں ہوتا ہے۔ ان کا تعلق بھی غلام خاندان سے تھا۔ ان کا آبائی وطن بصرہ تھا اور وہیں ۱۲۰ھ میں پیدا ہوئے۔ (۱)

علم و فضل کے اعتبار سے زمرہ تبع تابعین کے گوہر شب چراغ تھے۔ تمام علومِ اسلامیہ میں ان کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ حدیث اور فقہ میں ان کے جامع الکمالات ہونے کا اعتراف علمائے سیر و تاریخ نے کیا ہے۔ حدیث میں ان کا مرتبہ و مقام بہت بلند تھا۔ اہل عراق میں انہی کے دم سے حدیث کا چرچا ہوا۔ (۲)

امام صاحب کو حدیث نبوی ﷺ سے بہت زیادہ شغف تھا' لیکن اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں ذوقِ تنقید اتنا صحیح دیا تھا کہ صحیح و سقیم حدیثوں میں فوراً امتیاز کر لیتے تھے۔ امام ابن المدینی فرماتے ہیں:

''ہمارے معاصرین میں تین شخص ایسے ہیں جنہوں نے علم حدیث کی طرف توجہ کی اور زندگی بھر حدیث سے تعلق رکھا اور وہ ہیں یحییٰ بن سعید القطان' سفیان بن حبیب اور یزید بن زریع''۔ (۳)

امام احمد بن حنبل نے ان کے علمی تبحر اور جلالت شان کا اعتراف کیا ہے۔ خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں امام احمد کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

''میری آنکھوں نے یحییٰ بن سعید جیسا عالم نہیں دیکھا''۔ (۴)

حافظ ابن حجر نے امام نووی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

''امام یحییٰ بن سعید القطان کے علم و فضل' امامت و جلالت اور صلاح و تقویٰ پر سب علماء کا اتفاق ہے۔ ان کے علم و فضل کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ

جب کسی مسئلہ میں ائمہ حدیث کے درمیان اختلاف ہوتا تھا تو یہ حکم مقرر ہوتے تھے''۔(۵)

علمائے کرام کا اس پر اتفاق ہے کہ

''امام یحییٰ بن سعید القطان حدیث میں ثقہ وثابت تھے''۔

اساتذہ

امام یحییٰ بن سعید نے جن نامور محدثین کرام سے اکتساب فیض کیا ان کے نام یہ ہیں:

امام مالک بن اَنسؒ ' امام اوزاعی' امام سفیان ثوری' امام یحییٰ بن سعید انصاری' امام ہشام بن عروہ' امام اعمش' امام مسعر بن کدام' امام سفیان بن عیینہ۔(۶)

تلامذہ

امام یحییٰ بن سعید القطان کے مشہور تلامذہ یہ ہیں:

امام احمد بن حنبل' امام یحییٰ بن معین' امام اسحاق بن راہویہ' امام عبدالرحمٰن بن مہدی' امام ابوبکر بن شیبہ' امام بندار اور امام علی بن المدینی۔(۷)

جلالت علم

ان کے علمی تبحر' جلالت قدر اور تمام علومِ اسلامیہ میں جامع الکمالات ہونے کا محدثین کرام اور اربابِ سیر نے اعتراف کیا ہے۔

امام بندار نے انہیں ''امام اہل زمانہ'' کا لقب دیا ہے۔

امام ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب نسائی فرماتے ہیں کہ:

''رسول اللہ ﷺ کی حدیث کے اللہ کی طرف سے امانت دار تین بزرگ ہیں' امام مالک' شعبہ' یحییٰ بن سعید القطان۔(۸)

اللہ تعالیٰ نے اُن کو قوت حافظہ کی غیر معمولی نعمت سے نوازا تھا۔ یوں تو عام ائمہ حدیث کو بھی اللہ تعالیٰ نے اس نعمت سے سرفراز کیا تھا مگر بعض ائمہ حدیث اس اعتبار سے ضرب المثل تھے۔ ان میں امام یحییٰ بن سعید بھی شامل ہیں۔(۹)

سیرت واخلاق وکردار

امام یحییٰ بن سعید القطان اپنے اخلاق وکردار کے اعتبار سے بلند مرتبہ ومقام کے

حامل تھے۔عبادت' خشیت الٰہی' زہد و ورع' تقویٰ وطہارت اور امانت و دیانت میں اسلام کی زندہ تصویر تھے۔امام بندار اُن کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔

حافظ ابن حجر نے ان کا یہ قول تہذیب التہذیب میں نقل کیا ہے:

اختلفتُ الی یحیی بن سعید القطان عشرین سنۃً فما اظن انہ عصی اللہ (۱۰)

''میں نے ۲۰ سال یحییٰ بن سعید القطان کی خدمت میں آمد و رفت رکھی۔ میرا گمان ہے کہ اس مدت میں انہوں نے کبھی کوئی ایسا کام نہیں کیا جسے اللہ کی نافرمانی کہا جا سکے''۔

کلامِ الٰہی سے بہت زیادہ شغف تھا۔لیکن وہ محض قرآن خواں نہیں تھے بلکہ ان پر قرآن کا وہی اثر ہوتا تھا جو قلب مؤمن پر ہونا چاہئے۔خطیب بغدادی اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ:

ایک دفعہ سورۃ الدخان کی تلاوت شروع کی۔جب اس آیت پر پہنچے:

﴿اِنَّ یَوْمَ الْفَصْلِ مِیْقَاتُھُمْ اَجْمَعِیْنَ۝﴾

''فیصلہ کے دن سب لوگ حاضر ہوں گے''

تو ان پر لرزہ طاری ہو گیا اور بے ہوش ہو گئے۔ (۱۱)

متانت' سنجیدگی' قناعت' سادگی اور وضع داری کے پیکر تھے۔

وفات

امام یحییٰ بن سعید نے صفر ۱۹۸ھ میں وفات پائی۔عمر ۷۸ سال تھی۔ (۱۲)

حواشی

۱) نووی' تہذیب الاسماء' ج ۲' ص ۱۵۴
۲) ابن حجر' تہذیب التہذیب' ج ۱۱' ص ۲۲۰
۳) خطیب بغدادی' تاریخ بغداد' ج ۱۴' ص ۱۴۰
۴) خطیب بغدادی' تاریخ بغداد' ج ۱۴' ص ۱۳۹
۵) ابن حجر' تہذیب التہذیب' ج ۱۱' ص ۲۱۸
۶) نووی' تہذیب الاسماء' ج ۲' ص ۱۵۴
۷) خطیب' تاریخ بغداد' ج ۱۱' ص ۲۱۹
۸) ذہبی' تذکرۃ الحفاظ' ج ۱' ص ۲۷۵
۹) نووی' تہذیب الاسماء' ج ۲' ص ۱۵۵
۱۰) ابن حجر' تہذیب التہذیب' ج ۱۱' ص ۲۱۹
۱۱) خطیب' تاریخ بغداد' ج ۱۱' ص ۲۱۹
۱۲) سعید احمد اکبر آبادی' غلامان اسلام' ص ۲۷۴

تعارف وتبصرۂ کتب

تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

——(۱)——

نام کتاب : حقیقت احوال
مصنف : اشفاق الرحمٰن خان شیروانی
ضخامت : 160 صفحات
قیمت : 60 روپے
ملنے کا پتہ : 51-2 ڈی بلاک' ماڈل ٹاؤن لاہور

مصنف نے قرآن وسنّت کی روشنی میں اصلاحِ احوال کے مختلف عنوانات کے تحت مختصر مضامین لکھے ہیں جو مستند اور پر تاثیر ہیں۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ انسان حیات دُنیوی میں از اوّل تا آخر امتحان و ابتلاء میں ہے' مگر عام طور پر زندگی کی مصروفیات' یہاں کی چہل پہل اور رونق' مال ومتاع کی طلب' خواہشاتِ نفسانی کے حصول' لذات کی کشش اور محبوب چیزوں کی محبت انسان کو غافل رکھتی ہے' یہاں تک کہ اس کی عمر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے۔ اور اس انتقال کے ساتھ ہی اگلی اور حقیقی زندگی کا آغاز ہو جاتا ہے۔ جو لوگ حیاتِ دُنیوی کو لہو ولعب اور غفلت میں ضائع کر بیٹھے وہ اب پچھتائیں گے' مگر یہ پچھتاوا اُس وقت کسی کام نہ آئے گا۔ اس کے برعکس جن لوگوں نے اپنے پروردگار کے سامنے حاضر ہونے کا خیال رکھا' اللہ کے احکام پر رسول اللہ ﷺ کے طریقے کے مطابق عمل پیرا رہے' بھلائیاں کرتے رہے اور برائیوں سے بچنے کی کوشش کی' پھر اپنے گناہوں اور تقصیروں پر اللہ سے استغفار کرتے رہے وہ ربّ العالمین کی طرف سے راحت اور آرام کی زندگی پائیں گے۔

اس کتاب میں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اصلاحِ احوال اور تزکیۂ نفس کے لئے اعمال وافعال کی یاد دہانی کرائی گئی ہے۔ مصنف کا انداز سادہ مگر تاثیر سے مملو

ہے۔ حکمت اور دانائی کی جو باتیں مصنف نے اس کتاب میں جمع کر دی ہیں قارئین کے لئے بہت مفید اور ضروری ہیں۔ خاص طور پر اس میں فرائض کی ادائیگی کے ساتھ ان اذکار اور اوراد و وظائف کی ترغیب بھی دی گئی ہے جو ہمہ تن آیاتِ قرآنی پر مشتمل یا سنّت سے ثابت ہیں۔

مصنف کی دوسری اصلاحی کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی ان کے خلوص و اخلاص کی مُنہ بولتی تصویر ہے اور نصح و خیر خواہی کی آئینہ دار ہے۔

یہ کتاب صحیح اسلامی تعلیمات پر مشتمل ہے اور عوام الناس کے لئے بہت مفید ہے۔ البتہ کمپوزنگ کی غلطیاں قاری کے تکدر خاطر کا باعث ہیں۔ بعض جگہ آیات اور احادیث میں اعراب کی غلطیاں عبارت کو مہمل اور بے معنی بنا رہی ہیں۔ ضروری ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں ان اغلاط کی اصلاح کا انتظام کیا جائے۔

(۲)

نام کتاب : کیا اناجیل خدا کا کلام ہیں؟
مصنف : ابو بلال ناصر غنے
ضخامت : 100 صفحات
قیمت : غیر مسلم کے لئے مفت، مسلم کے لئے 10 روپے کے ٹکٹ
ملنے کا پتہ : اسلامک ایجوکیشن سنٹر جلال پور جٹاں، گجرات (پاکستان)

ویسے تو بہت سی انجیلیں ہیں مگر ان میں سے چار کو شہرت حاصل ہے، یعنی متی، مرقس، یوحنا اور لوقا۔ مصنف نے ان چاروں اناجیل کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے جس کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ ان اناجیل اربعہ کے بیانات میں صریح اور واضح تضاد موجود ہے۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے اس نے جا بجا ہر ایک انجیل کا بیان لکھ کر اس کے مقابل کے لئے دوسری انجیل کا بیان بھی مع حوالہ لکھ دیا ہے، تاکہ قارئین خود جان لیں کہ مختلف انجیلوں کے بیانات میں کتنا تضاد موجود ہے۔ پھر حضرت مسیحؑ کے حوالے سے کئی پیشین گوئیاں بھی انہی اناجیل سے نقل کی ہیں جو درست ثابت نہ

ہوئیں۔ اناجیل میں پائے جانے والے تضادات کے پیش نظر مصنف نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ موجودہ اناجیل قطعاً خدا کا کلام نہیں اور نہ یہ روح القدس کی سرشاری کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔ یہ محض خالصتاً انسانی کوشش کے طور پر لکھی گئی ہیں جن میں زیادہ تر حصہ سنی سنائی باتوں پر مبنی ہے۔ وہ مسیحی حضرات کو دعوت دیتا ہے کہ وہ حضرت مسیحؑ کی اصل سیرت و کردار کو جاننے کے لئے قرآن کو اللہ کا کلام مان لیں اور اس کے مطابق مسیح کے بارے میں عقائد اختیار کریں' ورنہ وہ گمراہی میں بھٹکتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو جائیں گے جہاں عذابِ شدید سے نہ بچ سکیں گے۔ کیونکہ اس وقت صرف قرآن مجید ہی ایک ایسی الہامی کتاب ہے جو پہلی کتابوں کی سچی تعلیمات کی امین ہے اور جس کا یہ دعویٰ ہے کہ اس میں کہیں بھی تضاد نہیں پایا جاتا۔ اور اس کی حقانیت کی یہی دلیل کافی ہے' کیونکہ ﴿وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا﴾ "اور اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو تم اس کے اندر بہت اختلاف پاتے"۔ نیز خود حضرت مسیحؑ نے یہ فرمایا ہے:

"لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے' کیونکہ اگر میں نہ جاؤں گا تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا' لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا"۔

یہ کتاب عیسائیوں کے لئے مفید ہے اگر وہ خلوصِ نیت کے ساتھ حق و باطل میں فرق معلوم کرنا چاہیں۔ نیز مسلمانوں کے لئے بھی فائدہ مند ہے تاکہ وہ عیسائیت کے غلط پروپیگنڈے کی اصلیت کو جان سکیں۔ کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کا عیسائیت پر گہرا مطالعہ ہے اور اس نے اپنے دعویٰ کی صداقت میں اناجیل اربعہ کے حوالہ جات نقل کئے ہیں۔ کتاب یقیناً مفید مطالعہ ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اولوالعزم رسولوں میں سے ہیں۔ ان کے بارے میں صحت مند عقائد رکھنا ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے۔

✿ تصوف کے چشمۂ صافی کو کیسے ایک جوہڑ بنا دیا گیا؟

✿ ارباب تصوف روافض اور سبائیوں کی دسیسہ کاریوں سے کیوں آگاہ نہ ہو سکے؟

✿ تصوف کے اصول و مبادی کو کتاب و سنت کی کسوٹی پر پرکھنا کیوں چھوڑ دیا گیا؟

✿ خانقاہیں ایزد پرستی کی درس گاہوں کے بجائے شخصیت پرستی کا مرکز کیسے بن گئیں؟

ان سب سوالوں کے جواب

اور

تصوف کی تاریخ کے حقیقت پسندانہ اور بے لاگ تجزیئے کے لئے

پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم

کی معرکۃ الآراء کتاب

''اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش''

کا مطالعہ کیجئے!

عمدہ کمپیوٹر کمپوزنگ' دیدہ زیب ٹائٹل' صفحات: 124' قیمت: -/48 روپے

ملنے کا پتہ:

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

قرآن اکیڈمی' 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور فون: 03-5869501